اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

جون ۲۰۱۹ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 June2019

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

❁ تدریس القرآن ① برائے معلمین	۱۹۰ صفحات
❁ تدریس القرآن ① برائے طلبہ و طالبات	۷۲
❁ تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک و گائیڈ	۱۶۰
❁ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
❁ ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
❁ تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۰
❁ اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
❁ نصابِ مدنیؐ	۴۰
❁ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
❁ حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۰
❁ ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۵۰
❁ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۳۰۰
❁ اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۵
❁ اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۵
❁ عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۷۰

ڈسکاؤنٹ سمیت
بدون ڈاک خرچ

کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور، فون نمبر: 0321-8836932
مکتبہ البرہان، A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،
0309-4607124

بلامعاوضہ

سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور قرآنی حلقوں میں
قرآن حکیم کا ترجمہ سکھانے کی منفرد کتاب

تدریس القرآن ①

❁ صرف ایک پارہ پڑھنے سے سارے قرآن کا ترجمہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔
❁ پانچویں سے اوپر کی جماعتوں کے لیے موزوں
❁ جدید اور سائنٹفک انداز۔ عربی گرامر کی الجھنوں اور رٹے سے دور
❁ اساتذہ اور طلبہ (وطالبات) کے لیے الگ کتابیں
❁ اساتذہ کے لیے فری ٹریننگ

تدریس القرآن فاؤنڈیشن

97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،

فون:0300-4354673،0333-4287640

ڈاکٹر محمد امین کی نئی تالیف

تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت

[تربیتِ طلبہ ہینڈ بک وگائیڈ]

اس سوال کا واضح جواب کہ تعلیمی اداروں میں طلبہ وطالبات کی اسلامی تربیت کیسے کی جائے؟

صفحات 160 سائز 20x30x8 قیمت:300 روپے

سکولوں کے لیے خاص رعایت

ملنے کا پتہ

کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور،فون نمبر:0321-8836932

مکتبہ البرھان،A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،

فون نمبر:0300-4354673

ماہنامہ البرہان لاہور
جلد ۲۳، شمارہ ۶، جون ۲۰۱۹ء / رمضان المبارک ۱۴۴۰ھ

مشمولات

○فکرونظر
احساسِ زیاں - ہلالِ عید ۴
○تعلیم و تربیت
-مسلمانوں کی قومی تعلیم مولانا محمد علی جوہرؒ ۶
-انگریزی ذریعۂ تعلیم کے نقصانات ڈاکٹر محمد امین ۱۳
- عصرِ حاضر میں اعلیٰ تعلیم (آخری قسط) پروفیسر ملک محمد حسین ۱۹
- چیف جسٹس کا ارشادِ گرامی مدیر ۲۵
- مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا؟ (۲) ۲۷
○اسلام اور پاکستان
- پاکستان میں دینی جدوجہد کی بڑی گنجائش ہے عاصم حفیظ ۲۹
-کیا دینی قوتیں بکاؤ مال ہیں؟ پروفیسر طارق بٹ ۳۲
- پاکستانی معاشرے میں ابلیسیت ابوعمیر ۳۴
-عمران حکومت کی اسلام مخالف کاروائیاں ۳۵
-انصاف کے ساتھ ناانصافی ڈاکٹر انوار احمد بگوی ۳۶
○اسلام اور مغرب
- ایران پر امریکہ کا متوقع حملہ ۴۰
- جمہوریت 'روحِ عصر' اور اسلامی ہے محمد رشید ۴۱
- مغربی جمہوریت کی 'روحِ عصر' غیر اسلامی ہے ڈاکٹر محمد امین ۴۸
- دہشت گرد کون - مغرب یا مسلمان؟ محمد صفدر بشیر ۵۳
○شذرات
مختصر تبصرے مدیر ۵۴
○استفسارات
فہم قرآن سے متعلق چند سوالات سلیم طارق لون ۵۷

فکرونظر

احساسِ زیاں

الوداع !اے ماہِ صیام،الوداع!
مَیں نے بھی کروڑوں مسلمانوں کی طرح روزہ رکھا
صبح سے شام تک بھوکا پیاسا رہا
لیکن
مَیں سوچتا ہوں
بھوک اور پیاس کے سوا مجھے کیا حاصل ہوا؟

کیا آپ نے بھی کبھی سوچا ہے؟
کہ آپ نے رمضان سے کیا پایا؟

چلیے! ہم نے کچھ نہیں پایا
لیکن
اگر ہم نے اپنا احتساب کرنا سیکھ لیا
کہ کیوں نہیں پایا؟
تو سمجھیے بہت کچھ پالیا
کہ احساسِ زیاں تو ہے!

فکرونظر

ہلالِ عید

جو مہینہ بھر بھوکے رہے

ان کا حق ہے کہ عید پر خوش ہوں

پکوان پکیں، خوشبوئیں مہکیں اور تھال سجیں

لیکن

کیا عید کی خوشی بس اتنی سی ہے کہ پیٹ بھریں

اگر روزہ نام ہے صبر کا، ثبات کا، احتساب کا، ضبطِ نفس کا، رضائے پروردگار کا

تو عید کو پیغام لانا چاہیے

اتحاد کا، استحکام کا، خوشحالی کا، سربلندی کا

اور اگر یہ نہیں

تو ہلالِ عید کو حق ہے کہ ہماری ہنسی اُڑائے

تعلیم و تربیت

مولانا محمد علی جوہرؒ
ترجمہ: بشیر احمد وانی

مسلمانوں کی قومی تعلیم

جامعہ ملیہ کے قیام کے وقت تعلیم کے بارے میں مولانا جوہرؒ کے خیالات وافکار

آزادی کے بعد ہی سے نہیں بلکہ دورِ غلامی میں بھی تعلیم ہمارا اہم ترین قومی مسئلہ رہا ہے اور مشکلات اور مخالفتوں کے باوجود مسلمان اہلِ فکر اور رہنماؤں نے کسی نہ کسی حیثیت سے ملی تشخص اور ثقافتی روایات کو برقرار رکھنے کی کوششیں کی ہیں۔ جب علی گڑھ سے درمند اور حساس مسلمانوں کو مایوسی اور ناکامی ہوئی، تو مولانا محمد علی جوہر (خدا اپنی رحمتیں ان پر نازل کرے) نے ۱۹۲۱ء میں جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم کی۔ کامریڈ کی ۲۳ جنوری اور یکم فروری ۱۹۲۶ء کی اشاعتوں میں انہوں نے جامعہ سے متعلق اپنے خیالات سپردِ قلم کیے اور اس ضمن میں دراصل ان تبدیلیوں کا ایک مختصر سا جائزہ لیا جو رائج الوقت نظامِ تعلیم میں مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے ہونا مطلوب تھیں (مترجم)۔

مذہبی تعلیم

ہمارے نزدیک مسلمانوں کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ وہ لفظ مسلم کے صحیح ترین معنوں کے لحاظ سے مسلم بن جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ہم دنیوی اور روحانی امور کا تباہ کن فرق ہرگز برداشت نہ کریں اور نہ مسلمانوں میں پادریوں کی طرح کے کسی الگ طبقہ اور عوام الناس میں فرق کے رجحان کی حوصلہ افزائی کریں۔ اُن خامیوں کو جن سے اس ملک میں مسلم معاشرہ دوچار تھا، بہت پہلے سمجھ لیا جانا چاہیے تھا اور اس کے مطابق اُن کا حل تلاش کیا جانا چاہیے تھا اور اسے تعلیم کے منصوبوں میں سمودیا جانا چاہیے تھا۔ وہ منزل جسے ہمیشہ پیشِ نظر رکھا گیا یہ تھی کہ ان اداروں سے ایسے نوجوان پیدا کیے جاسکیں جو نہ صرف ثقافت کے جدید معیار پر پورے اُترتے ہوں بلکہ حقیقی اسلامی روح رکھنے والے مسلمان بھی ہوں اور اپنے مذہب کے بارے میں اتنا علم رکھتے ہوں کہ وہ داعیانِ اسلام کی صفوں میں ازخود اپنا مقام بنا سکیں۔ اس بات کو خصوصاً محسوس کیا گیا تھا کہ تہذیب یافتہ مسلمانوں کو بھی اپنے دین

کے بارے میں اس قدر کم علم تھا کہ وہ مذہب سے متعلق سارے امور کو علماء کے ایک چھوٹے سے گروہ کے سپرد کر کے اطمینان سے بیٹھ رہے تھے یا اسے بالکل نظر انداز کر دیا تھا اور اُن کی اپنی زندگی میں ان کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ یا وہ علماء کے اس گروہ میں کسی ایک یا زیادہ پر اندھا اعتماد کیے بیٹھے تھے۔ اس میں خود اُن کے لیے خیر تھی، نہ علماء کے لیے اور نہ اسلام کے لیے۔

اب یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ سرسید احمد خان کی قائم کردہ علی گڑھ یونیورسٹی مسلمانوں کی اس ضرورت کو پورا نہیں کر رہی تھی۔ بلکہ اس کے تربیت یافتہ نوجوان مطلوبہ رجحانات کے برعکس نظریات وتصورات لے کر میدان میں آ رہے تھے۔ وہ اسلام کی تعلیمات اور اس کی عالمگیر اور صدیوں پرانی تاریخ سے شرمناک حد تک ناواقف تھے۔ یہ وہ صورتِ حال تھی جس کی اصلاح کرنے کا بیڑا جامعہ ملیہ اسلامیہ یا علی گڑھ کی قومی مسلم یونیورسٹی کے منتظمین نے اٹھایا۔ اس مقصد کے لیے قرآن کریم کا بھرپور مطالعہ ایک ناگزیر ہتھیار تصور کیا گیا اور اس کے لیے تعلیم کے ہر مرحلہ پر کلام اللہ کو اچھی طرح سمجھ کر مطالعہ کرنے کا بندوبست کیا گیا تھا تاکہ مسلم معاشرہ کے وہ افراد بھی جو اقتصادی اور دوسرے گوناگوں مسائل کی وجہ سے پرائمری کے بعد اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکیں، نہ صرف عربی میں بلکہ اردو اور دوسرے ترجموں میں قرآن شریف کا مطالعہ کر چکے ہوں، انہوں نے اس سے آگے بڑھ کر پرائمری کے مرحلہ پر عربی زبان سے کچھ نہ کچھ واقفیت پر اصرار کیا کہ عربی زبان کے طریقۂ تدریس میں کچھ اہم تبدیلیاں کی جائیں۔ عربی کے موجودہ طریق تدریس کو جس میں ایک نوآموز گرامر کے دقیق قواعد میں اُلجھ جاتا ہے، ختم کر کے اس کی جگہ ایک سیدھا اور زیادہ فطری طریق وضع کرنا چاہیے۔ یہ ضروری ہے اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ بچے عربی زبان پر اتنا عبور حاصل کریں کہ وہ قرآن مجید کے سمجھنے میں انہیں عملاً مدد دے۔

مجوزہ منصوبہ یہ تھا کہ جب بچہ اُردو اور عربی الفاظ کو پہچاننے لگے تو اُسے قرآن شریف کی کچھ آخری مختصر سورتیں عربی اور سلیس اُردو ترجمہ میں پڑھا دینا چاہئیں۔ نماز میں جو کلمات پڑھے جاتے ہیں وہ بھی اسی طرح پڑھا دیئے جائیں تاکہ ایک سات سالہ بچہ بھی ایسی نماز نہ پڑھے جسے وہ سمجھ نہ رہا ہو۔ اس کے علاوہ یہ تجویز بھی تھی کہ جب بچہ بارہ یا تیرہ سال کی عمر میں اپنی پرائمری تعلیم ختم کر دے اور قرآن مجید کو عربی میں پڑھ لے تو اُسے سلیس ترجمۂ قرآن بھی

ختم کر چکنا چاہیے۔

یعنی وہ اس عمر میں نہ صرف قرآن مجید پڑھ سکے (جیسا کہ اب ہے) بلکہ اچھے خاصے حجم کی اُردو یا دوسری زبان کی کتاب بھی جو اس صورت میں قرآن کا ترجمہ ہوگا، پڑھ سکے۔

لیکن اس مرحلہ پر جیسا کہ کہا جا چکا ہے صرف اتنا ہی کافی نہیں سمجھا گیا تھا اس لیے یہ تجویز کیا گیا ہے کہ پرائمری کے آخری تین سالوں میں ایک بچے کو عربی اُسی طرح پڑھائی جائے جس طرح اب انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ طریق تعلیم میں ترقیوں کے باوجود دس سال کے بچے سے تین سال کی مدت میں ایک غیر ملکی زبان میں محدود سی دسترس کے حصول سے زیادہ کی توقع نہیں کی جا سکتی لیکن یہ امید تھی کہ وہ عربی کی اس ابتدائی دسترس کے ساتھ ساتھ جب ۵ سال یا زائد عرصہ کی مدت تک قرآن اور اس کا ترجمہ پڑھے گا تو اس میں اتنی دلچسپی اور جذبہ پیدا ہو جائے گا کہ وہ بین السطور ترجمہ کی مدد سے قرآن پڑھ سکے۔ دراصل یہی جذبہ اور ذوق وشوق تھا جس کا پیدا کیا جانا مقصود تھا اور یہ اندازہ تھا کہ بیان کردہ طریقہ کے سوا کسی اور طرح شاید یہ ممکن نہ ہوتا۔ ثانوی مرحلہ میں اس قدر تعلیم دی جاتی تھی جس قدر آج کل کے کالجوں میں انٹرمیڈیٹ جماعتوں میں دی جاتی ہے۔ عربی کی تعلیم اسی نقطۂ نظر کے تحت لازمی قرار دی جاتی تھی اور اسی لیے یہ تجویز کیا گیا کہ ان سالوں میں جو ایک نوجوان کی عمر کے سترھویں سال پر ختم ہوتے ہیں، طلباء کو درسی کتاب کے طور پر تمام قرآن شریف اور کچھ منتخب حدیثیں پڑھائی جانی چاہئیں اور پھر انہیں عربی کا بحیثیت ایک زندہ زبان کے مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ عربی لکھنے اور پڑھنے پر اتنا عبور حاصل کر سکیں جتنا آج انٹرمیڈیٹ کے طلباء کو انگریزی پر ہے۔ یہ تجویز کیا گیا تھا کہ گرامر کے صرف انتہائی ضروری حصے پڑھائے جائیں اور اسے پڑھانے کا موجودہ طریق ختم کر کے طالب علم کو عربی زبان کے صحیح استعمال کی مثالوں سے قواعد ذہن نشین کرائے جائیں، بجائے اس کے کہ وہ پہلے قواعد پر عبور حاصل کرے اور پھر درست فقرے بنائے۔

اس مرحلہ پر عربی زبان میں کسی اور نثر کی کتاب کی بھی تجویز کی گئی تھی کیونکہ اولاً تو یہاں زبان کا علم اتنا مقصود نہ تھا جتنا مطلوب قرآن کا قریبی علم تھا اور دوسرے یہ کہ اس مرحلہ پر زبان کے علم کے لیے بھی قرآن شریف کا مطالعہ کافی سمجھا گیا تھا، پھر بھی تجویز کیا گیا تھا کہ چند سو مخصوص اشعار بھی طلباء کو عربی شاعری سے مانوس کرانے کے لیے پڑھائے جائیں۔

اُمید تھی کہ قرآن مجید کا یہ مجوزہ مطالعہ ایک نوجوان کو کہیں بہتر مسلمان بنانے کا اور دینیات کے ذریعے درسی کتب کے مطالعہ کی نسبت وہ اپنے مذہب کا زیادہ اچھا علم حاصل کرے گا۔لیکن یہ مدعا نہیں تھا کہ مسلم تھیولوجی کے دوسرے علوم کی تعلیم نہ دی جائے۔اس کے لیے جو کچھ تجویز کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ پرائمری کے مرحلہ پر اولاً استاد اسلامی عبارات کی زبانی تعلیم دے اور ثانیاً ان درسی ریڈروں میں جن میں اسلامی تاریخ اور مناسب طور پر سائنسی معلومات بھی شامل ہوں،اسلامی عقائد اور اصولوں کے بارے میں اسباق شامل کیے جائیں۔

یہ بھی تجویز تھی کہ اس طرح سے عبادات،اخلاق اور سیرت کے بارے میں عقائد اور فقہ بھی پڑھائے جائیں تاکہ ایک بڑھتا ہوا بچہ اوائل عمر ہی سے انہیں جذب کر لے۔دینیات کی وہ تعلیم جو اب دی جاتی ہے وہ عبادات کے بارے میں ابتدائی فقہی معلومات سے آگے شاید ہی دی جاتی ہو اور یہ بھی کچھ اس طرح سے دی جاتی ہیں کہ طالب علم کا سارا ذوق وشوق ختم ہو جائے اور وہ اس کے لیے الٹی مصیبت بن جائے۔اس کی بجائے یہ تجویز کیا گیا تھا کہ اردو میں نہایت ماہرانہ انداز سے ایسی کتابیں تیار کی جائیں جن میں ادبی چاشنی اور کشش ہو تاکہ وہ ایک مسلمان بچے کو اس کے صحیح مسلم عقائد سے اور اس کے مذہب کے اہم احکامات سے آہستہ آہستہ بغیر کسی رکاوٹ کے واقف کرا دیں۔

ثانوی تعلیم کے مرحلے پر اور یونیورسٹی کے مدارج میں بھی فقہ،عقائد اور سیرت محض اردو کتابوں کی بجائے باقاعدہ الگ مضامین کی حیثیت سے تجویز کیے گئے تھے لیکن لیکچرز زبانی ہونا تھے۔اور یہ تجویز کیا گیا تھا کہ جہاں تک ہو سکے نصابی کتابوں سے گریز کیا جائے نصابی کتابیں عام طور پر خود اساتذہ کی رہنمائی کے لیے تھیں تاکہ موجودہ جمود کا علاج کیا جا سکے اور جدید تداوین کی بجائے بنیادی ماخذ پر زیادہ بھروسہ کیا جائے۔

جو کچھ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اس سے یہ اچھی طرح محسوس ہوا ہوگا کہ یہاں دینی تعلیم کو جو اہمیت دی جا رہی تھی وہ اس سے پہلے کسی بھی ایسے قومی ادارے میں جہاں سیکولر تعلیم بھی دی جاتی ہو،نہیں دی گئی تھی لیکن توقع تھی کہ یہ مجوزہ طریقہ اس طریقہ سے بھی کہیں بہتر ثابت ہوگا جو ان اداروں میں دینی تعلیم کے لیے اختیار کیا جاتا ہے جن کا واحد مقصد دینیات اور اسلامیات کی تعلیم ہے۔

یونیورسٹی کے مرحلہ پر معارف اسلامی کے کلیہ کی گنجائش رکھی گئی تھی جہاں ایسا نوجوان مسلمان جس نے اتنی سیکولر تعلیم حاصل کی ہو جتنی آج کے انٹرمیڈیٹ معیار تک کالجوں میں دی جاتی ہے، تفسیر، حدیث، فقہ اور ان سب کے 'اصول'، عقائد اور کلام، سیرت اور تاریخ اسلام، (جس کے ساتھ جغرافیہ کا ضروری علم بھی ہو) کی تعلیم حاصل کر سکے اور وہ اس کورس کے اختتام پر جب کہ اس کی عمر ۲۰ برس یا اس کے لگ بھگ ہو، ایک مستند مذہبی استاد یا مولوی جتنی اہمیت رکھتا ہو، اور ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کیا جائے کہ وہ اتنا ہی تہذیب یافتہ ہے، جتنا کسی بھی یورپی یونیورسٹی کا گریجویٹ ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد وہ ڈاکٹریٹ کر سکتا تھا جس کے لیے مذہب سے متعلق مندرجہ بالا موضوعات میں سے کسی ایک پر تحقیقی مقالہ کی ضرورت ہوتی۔ خیال تھا کہ اس طرح پہلی بار دنیوی اور دینی تعلیم کا وہ امتزاج ہوگا جس سے بلا شبہ دونوں ہی کو فائدہ ہوگا۔ اور ان دونوں میں وہ بُعد اور علیحدگی جس نے دینی تعلیم کو جامد اور دینوی تعلیم کو بے روح اور بے خدا بنا رکھا ہے، دور ہوگی۔

ذریعۂ تعلیم

تعلیم کے مذہبی عنوان کے بعد کہ جس کو اتنی اہمیت دی گئی جتنی اس سے پہلے کبھی نہ دی گئی تھی، دوسری اہم بات جس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا وہ یہ تھی کہ مختلف علوم اور مضامین میں غیر ملکی زبان کے ذریعہ تعلیم کے غلامانہ اور واہیات تصور کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ ثانوی مرحلہ پر انگریزی زبان کی تعلیم کو بحیثیت ایک اختیاری مضمون کے شامل کیا جانا چاہیے اور مناسب یہ ہے کہ کم از کم کچھ مدت تک، سکولوں کے اکثر طلباء اس زبان کو ۱۳ سال کی عمر کے بعد پڑھیں، لیکن اسے پرائمری مرحلہ سے بالکل ختم کر دینا چاہیے اور اسے کسی حالت میں بھی ذریعہ تعلیم نہ ہونا چاہیے گو کچھ عرصہ تک بعض سائنسی علوم میں یورپی اصطلاحات کا استعمال ضروری ہو سکتا ہے۔

تاہم ثانوی مرحلہ پر سکول کے طلباء کو اس بات کی اجازت ہونی چاہیے کہ وہ کسی بھی یورپی زبان کا مطالعہ کر سکیں۔ ان ثانوی سکولوں میں انگریزی کے ساتھ ساتھ فرانسیسی اور جرمن زبان بھی پڑھائی جانی چاہیے۔

لیکن ایشیائی زبانوں کی تدریس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اولین اہمیت مادری زبانوں

کی تعلیم کی ہوگی اور اس کے بعد جہاں اردو مادری زبان ہو وہاں ہندی اور جہاں اردو مقامی طور پر نہ بولی جاتی ہو وہاں اردو کا انتظام ہو مگر ابھی مختلف زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد اور ہماری موجودہ ضروریات کے پیش نظر اور کچھ عرصہ بعد یونیورسٹی کے منظور شدہ کسی بھی مضمون میں مادری زبان میں ڈگری دی جانی چاہیے۔ اس سے ان نئی کتب کی تیاری کی بڑی حوصلہ افزائی ہوگی جن کی دوسری باتوں کے علاوہ تعلیمی مقاصد کے لیے بھی بڑی مانگ ہے۔

مادری زبانوں میں لازمی تعلیم اور ہر مرحلہ پر اسی کے ذریعۂ تعلیم ہونے کے علاوہ اسکولوں میں مادری زبانوں کے علاوہ کسی اور ایشیائی زبان کی اختیاری تعلیم کا انتظام بھی ہونا چاہیے۔ یونیورسٹی کے مرحلہ پر عربی اور فارسی (ادب و زبان) دونوں کی ڈگری کی گنجائش ہونی چاہیے اور مادری زبان اور عربی فارسی کے علاوہ کسی دو مشرقی زبانوں میں محض زبان دانی کی اہلیت کی بھی گنجائش ہونی چاہیے۔

چونکہ ایک غیر ملکی زبان کو بحیثیت ذریعۂ تعلیم ختم کیا جانا ہے اس لیے یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ طلباء اتنے ہی سالوں میں جن میں وہ موجودہ اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم مکمل کرتے ہیں زیادہ گہرا اور زیادہ وسیع علم حاصل کر سکیں گے۔ ایک ایسے طالب علم سے جس نے پرائمری کا کورس پاس کر لیا ہو، یہ توقع ہوگی کہ وہ:

۱۔ مسلم تھیولوجی کی مبادیات سے خوب اچھی طرح واقف ہو۔ اگر یہ مضمون مجوزہ طریقہ کے مطابق پڑھا گیا تو وہ دنیوی لحاظ سے سب سے زیادہ عملی افادیت کا حامل ہوگا اور تہذیب و ثقافت اور روایات کے لحاظ سے بھی بڑا قیمتی ہوگا۔

۲۔ اتنی عربی جانتا ہو کہ وہ نہایت ذوق و شوق سے قرآن پاک پڑھ سکے۔

۳۔ عملی ضروریات کے لیے جتنا حساب ضروری ہے اتنے حساب سے ابتدائی عملی جیومیٹری اور پیمائش و اوزان کے ضروری علم سے اور بک کیپنگ کی ابتدائیات سے اچھی طرح واقف ہو۔ ایک دیہات میں رہنے والے لڑکے کو یہ سب واقفیت بعد کی زندگی میں بہت کام آئے گی۔

۴۔ مختلف سائنسی علوم سے متعلق وسیع اور مستند معلومات، خواہ ابتدائی نوعیت ہی کی کیوں نہ ہوں، رکھتا ہو۔

۵۔ عالمی تحریکوں کے پس منظر میں اسلام اور ہندوستان کی تاریخ کے بنیادی خطوط سے آگاہ ہو۔

٦۔ ہندوستان کے جغرافیہ سے تفصیلاً اور دیگر اسلامی ممالک کے جغرافیہ سے، ان کے دوسرے ممالک سے تعلقات کی نسبت سے عموماً واقف ہو۔

۷۔ اپنے ملک کی حکومت کے دستور کے واضح خطوط اور اپنے ضلع کی انتظامی ہیئت سے واقف ہو۔

۸۔ شہری کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں اور حقوق وفرائض پہچانتا ہو۔

اس مرحلہ کے اختتام پر اسے اپنی زبان کو آسانی سے پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہونا چاہیے تاکہ وہ مختلف درخواستوں وغیرہ کے لکھنے کے لیے یا ان دستاویزات کو لکھنے اور سمجھنے کے لیے جن پر اسے دستخط کرنے ہوں وہ پیشہ ور منشیوں کا محتاج نہ ہو۔

ثانوی کورس کے پاس کرنے والے طالب علم سے یہ توقع ہوگی کہ وہ اپنے مذہب کی تعلیمات کا علم رکھتا ہو، عربی میں قرآن کا اچھا خاصا تفصیلی علم اسے حاصل ہو، اپنی زبان کے لٹریچر کو پڑھ سکے اور اس سے لطف اٹھا سکے۔ اس میں آسانی سے ایسی عبارت لکھ سکے جس میں ادبی حسن بھی پایا جاتا ہو، آسان فارسی پڑھ سکے اور اگر اس کی زبان اُردو ہے تو ہندی پڑھ سکے اور اُردو کے علاوہ کوئی زبان ہے تو درج ذیل مضامین میں سے تین میں موجودہ انٹرمیڈیٹ معیار کی استعداد رکھتا ہو: کوئی یورپی زبان یا مادری زبان کے علاوہ کوئی ایشیائی زبان۔ تاریخ (تاریخ ہند، تاریخِ اسلام اور کوئی تاریخی مضمون) جغرافیہ مدنیات اور سیاسیات مدنی، معاشیات سائنس فطری (کوئی سے تین مضامین) ریاضی، منطق، مبادیاتِ نفسیات اور ڈرائنگ۔

یونیورسٹی کے مرحلے میں اپنے مذہب کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنے اور تھیولوجی کی معیاری کتابوں سے آگاہی حاصل کرنے کے علاوہ اُسے تاریخ، عمرانیات، فلسفہ، ریاضی، ادب یا قانون میں سے کسی ایک کے لینے اور اس میں یورپین یونیورسٹیوں کے بی۔اے کے معیار تک یا موجودہ ہندوستانی یونیورسٹیوں کے ایم اے کی ڈگری تک کی استعداد پیدا کرنے کے لیے کہا جائے (جاری ہے)۔

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

انگریزی ذریعۂ تعلیم

بے شمار تعلیمی نقصانات اور مغرب کی فکری غلامی کا منبع

ہم انگریزی زبان کی نہیں انگریزی ذریعۂ تعلیم کی مخالفت کرتے ہیں

۱۔ ہمیں پچھلے دنوں لاہور میں ایک سرکاری سکول کے باہر یہ لکھا دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ''یہاں ذریعۂ تعلیم اردو ہے''، لیکن افسوس کہ ہمارے پرائیویٹ سیکٹر کے اکثر بلکہ سارے ہی سکول انگریزی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنائے ہوئے ہیں اور مزید افسوسناک یہ کہ وہ سکول جو خود کو 'اسلامی سکول' باور کراتے ہیں وہ بھی انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے پر مصر ہیں۔ حالانکہ انگریزی ذریعۂ تعلیم سے نہ صرف اسلامی مقاصد اور نظریۂ پاکستان کی نفی ہوتی ہے بلکہ یہ پاکستانیت کے مفاد کے خلاف بھی ہے۔ اور لطف یہ کہ یہ حکومتی مطالبہ بھی نہیں۔

۲۔ انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مغرب کی ملحدانہ فکر و تہذیب اس وقت دنیا پر غالب ہے اور اس تہذیب کے علمبردار ممالک اس کے غلبے کو قائم رکھنے کے لیے ترغیب و ترہیب کا ہر ذریعہ استعمال کرتے ہیں چنانچہ پاکستانی تناظر میں دیکھیے کہ مغربی قوتوں نے اپنے اثر و رسوخ سے لارڈ میکالے کے بنائے ہوئے نظام تعلیم کو پاکستان میں ڈنٹ نہیں پڑنے دیا (ایک مریل سے اسلامیات اور مطالعۂ پاکستان کے مضمون کی اس کے مجموعی مزاج کے سامنے کوئی حیثیت نہیں) اور انگریزی ذریعۂ تعلیم اور لازمی انگریزی کے ذریعے مغرب نے اپنا فکری، تہذیبی، علمی اور تعلیمی (بلکہ عملی) غلبہ ابھی تک برقرار رکھا ہوا ہے۔ اور ہمیں بحیثیت مسلمان اور پاکستانی کے اس کی شناعت کا احساس بھی نہیں اور ہم مجبوراً اور دباؤ میں آ کر نہیں بلکہ اپنی مرضی اور خوشی سے بلکہ فخر کے ساتھ اسے اپنائے ہوئے ہیں۔ احساسِ زیاں کے اس خاتمے کی وجہ بھی فکری غلامی ہے جیسا کہ حکیم الامت نے بہت پہلے کہا تھا کہ ؎

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

۳۔ ہم نے ایک دوست کے پوچھنے پر اسے بتایا کہ ہم تازہ البرہان میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کے خلاف مضمون لکھ رہے ہیں تو اس نے کہا کہ یہ موضوع پرانا ہو چکا اب اس پر بحث فضول ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایک ''برائی'' کو اگر عامۃ المسلمین اور اسلامی عناصر قبول کر لیں اور وہ معاشرے میں پھیل جائے تو کیا وہ ''اچھائی'' بن جاتی ہے؟ اور ہمیں اس کو قبول کر لینا چاہیے بلکہ اس کے مبلغ بن جانا چاہیے کہ یہ 'روحِ عصر' کا تقاضا ہے؟ ہرگز نہیں! برائی برائی ہی رہتی ہے خواہ ساری دنیا اسے اچھائی کہنے لگے، لہٰذا ہم اسے برائی کہتے رہیں گے، اس کے خلاف دلائل دیتے رہیں گے اور لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہیں گے کہ دیکھو! یہ برائی ہے، اسے چھوڑ دینا چاہیے۔

انگریزی ذریعۂ تعلیم کے خلاف ہمارے پاس کیا دلائل ہیں اور ہم کیوں اسے غلط اور برا کہتے ہیں ملاحظہ فرمایئے:

انگریزی ذریعۂ تعلیم کے نقصانات

۱۔ مغرب کی فکری غلامی

انگریزی ذریعۂ تعلیم کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ طالب علم کے اندر مغربی تہذیب کی فکری غلامی کو پختہ کرتا ہے۔ کس کو نہیں پتہ کہ نظامِ تعلیم کے سارے اجزاء مل کر انسان کی ذہن سازی اور تعمیرِ سیرت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ نصاب کا اثر انسانی شخصیت پر ایسے ہی پڑتا ہے جیسے انسانی جسم پر اس میں رواں دواں خون کا۔ جبکہ ہمارے ہاں جدید تعلیم میں نہ صرف اسلامیات کا نصاب غیر موثر ہے بلکہ سارے نصابات خصوصاً سوشل سائنسز کا نصاب مغرب زدہ ہے اور اسلامی تصورات سے تہی دامن ہے اور مسلمان بچے کی شخصیت میں غیر اسلامی رجحانات کی پرورش کرتا ہے۔ رہے اساتذہ تو انہیں بتانے والا کوئی نہیں کہ ان کی بنیادی ذمہ داری بچے کی اسلامی تربیت اور اسے اچھا مسلمان بنانا ہے۔ جہاں تک انتظامیہ کا تعلق ہے تو ان کے لیے تعلیم کاروبار ہے اور اس تجارت سے زیادہ سے زیادہ نفع کمانا ان کا ہدف ہوتا ہے لہٰذا وہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی لباس، انگریزی ذریعۂ تعلیم، آکسفورڈ کی کتابوں اور او اے لیول کے نصاب و امتحانات سے فیسیں زیادہ ملیں گی لہٰذا انہیں

اپنانے میں کوئی حرج نہیں۔ یوں انگریزی ذریعۂ تعلیم انگریزی زبان سکھانے کا ایک آلہ نہیں بلکہ مغربی تہذیب اوراس کی روایات واقدار مسلمان بچوں کے ذہن میں راسخ کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

۲۔شرح تعلیم میں کمی

انگریزی ذریعۂ تعلیم کا دوسرا بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ پاکستان میں ناخواندگی بڑھانے کا بنیادی سبب ہے۔ وہ یوں کہ جب پاکستانی سکولوں میں پرائمری میں بھی ذریعۂ تعلیم انگریزی کو بنایا جاتا ہے اور بچے کا گھر کا اور معاشرے کا ماحول اس اجنبی، غیر مانوس اور اوپر سے مسلط کی گئی زبان سے موانست نہیں رکھتا تو بچہ اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ سبق یاد نہیں ہوتا تو استاد سے مار پڑتی ہے نتیجہ یہ کہ اسے سکول سے بھاگنے ہی میں عافیت محسوس ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں پرائمری سطح پر ڈراپ آؤٹ ریٹ ۴۰ سے ۵۰ فیصد ہے۔ اسی طرح جو لوگ مڈل اور میٹرک میں فیل ہوتے ہیں ان کی بہت بڑی اکثریت وہ ہے جو لازمی انگریزی کے مضمون میں فیل ہوتی ہے اور جب وہ یہ مضمون پاس نہیں کر سکتی تو ان کی اکثریت تعلیم چھوڑ دیتی ہے اور اگلی کلاس میں داخلہ نہیں لیتی، نہیں لے سکتی۔ اس طرح انگریزی ذریعۂ تعلیم اور لازمی انگریزی پاکستان میں شرح خواندگی کم کرنے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔

اس کا حل بالکل سادہ اور واضح ہے اور وہ یہ کہ انگریزی ذریعۂ تعلیم اور لازمی انگریزی کو ختم کر دیا جائے۔ دنیا بھر میں دوسری زبانیں سکول کے بعد یونیورسٹی میں سکھائی جاتی ہیں۔ چلیے آپ اسے میٹرک میں اختیاری مضمون کے طور پر رکھ لیجیے کہ جو بچہ انگریزی سیکھنا چاہتا ہے کہ یہ مستقبل کی تعلیم اور پروفیشن میں اس کے کام آئے، وہ اسے سیکھ لے لیکن اسے ہر طالب علم کے لیے لازمی نہ کیا جائے۔ دراصل انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنانے اور اسے لازمی مضمون رکھنے پر اصرار خود دورِ غلامی کی یادگار ہے اور مغرب کی فکری اور عملی غلامی پر اصرار کے مترادف ہے جس کے تعلیمی نقصانات بالکل واضح ہیں۔

۳۔بچے کی تخلیقی صلاحیتوں کا کچلا جانا

جب بچے کو پرائمری بلکہ پری پرائمری سے انگریزی ذریعۂ تعلیم میں ڈالا جاتا ہے تو

چونکہ گھر،سکول اور معاشرے کا ماحول اس سے موانست رکھنے والانہیں ہوتا لہٰذا بچہ تعلیمی مواد کو نہ سمجھ پاتا ہے اور نہ ہضم کر پاتا ہے۔اساتذہ بھی عام طور رٹر یںنڈ نہیں ہوتے کہ بچے کی مشکل کو سمجھ کراس کا ہاتھ بٹائیں۔نتیجتاً اس کا رجحان رٹے بازی کی طرف ہوجاتا ہے یعنی وہ چیزوں کو سمجھنے کی بجائے رٹ لیتا ہے، زبانی یاد کرلیتا ہے۔رٹے بازی (Memorization) کا یہ رویہ بچے میں تنقیدی سوچ (Critical Thinking) ابھرنے نہیں دیتا اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو کچلنا شروع کردیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے طلبہ Invention اور Innovation کی بجائے End-user اور Consumer بن کر زندگی گزارنے میں عافیت محسوس کرتے ہیں۔اس لحاظ سے دیکھا جائے تو انگریزی ذریعۂ تعلیم ایک لحاظ سے ملک دشمنی کے مترادف ہے کہ یہ معاشرے میں جوہرِقابل کے پنپنے میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

۴۔معیارِ تعلیم میں کمی

انگریزی ذریعۂ تعلیم کا ایک بڑا نقصان یہ بھی ہوا ہے کہ معیار تعلیم گر گیا ہے۔نصاب بچوں کو ثقیل،مشکل اور بھاری بھر لگتا ہے۔جو والدین انگریزی میں دسترس نہیں رکھتے وہ بچوں کو پڑھا نہیں سکتے، ناچار انہیں بچوں کو ٹیوشن اکیڈمیوں میں بھجوانا پڑتا ہے۔ جب دن کے وقت سکول میں پڑھانے والے اساتذہ نے شام کے ٹیوشن سنٹرز اور اکیڈمیاں کھول لیں تو ان کی توجہ شام کی اکیڈمیوں کی طرف زیادہ اور دن کے سکول کی طرف کم ہوگئی کیونکہ اکیڈمیوں کا پیسہ ان کی جیب میں جاتا تھا جبکہ سکول میں تو لگی بندھی تنخواہ ہی ملتی ہے۔اس وقت گلی گلی جو ٹیوشن سنٹر کھلے ہوئے ہیں ان کی ایک مصیبت یہ بھی ہے کہ وہ پیسوں کے لالچ میں زیادہ طلبہ وطالبات لے لیتے ہیں اور پھر ان کو انفرادی توجہ نہیں دے پاتے۔نتیجہ یہ کہ ٹیوشن پڑھانے کا مقصد فوت ہوجاتا ہے اور بچے سکول اور ٹیوشن سنٹر میں پڑھنے کے باوجود نالائق ہی رہتے ہیں اور بمشکل پاس ہو پاتے ہیں۔

۵۔ملی حمیت اور قومی غیرت کا خاتمہ

ہر انسان،قوم،ملت کی ایک پہچان ہوتی ہے جس میں زبان کا بھی ایک اہم مقام ہوتا ہے۔آپ فرانس، جرمنی، اٹلی، جاپان کہیں چلے جائیں لوگ آپ کو انگریزی بولتے اور لکھتے

نظر نہیں آئیں گے بلکہ ہر قوم اپنی زبان پر فخر کرتی ہے اور اسے ہی ذریعۂ تعلیم بناتی ہے۔ پھر ہم ہی کیوں ملی حمیت اور قومی غیرت سے عاری ہو گئے ہیں کہ ہم اردو زبان کو اپنانے اور اسے اہمیت دینے پر تیار نہیں؟ اور انگریزی سے صرف اس لیے چمٹے ہوئے ہیں کہ یہ کبھی ہمارے آقاؤں کی زبان تھی۔ یہ فکری غلامی کی انتہا ہے کہ ہم منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی بولنے اور تھری پیس سوٹ اور ٹائی پہن کر فخر محسوس کرتے ہیں اور اردو بولنے اور شلوار قمیص پہننے میں حقارت محسوس کرتے ہیں۔ آپ کسی امریکی سے کہیے کہ وہ اپنے چار سال کے بچے کو اردو میڈیم سکول میں بھیجے یا اس عمر میں اسے اردو سکھائی جائے تو وہ آپ کی دماغی صحت پر شک کا اظہار کرے گا اور آپ کے اصرار پر ممکن ہے تھپڑ مار کر آپ کا جبڑا توڑ دے۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی ہی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

چینی صدر یا وزیر خارجہ اگر امریکہ یا برطانیہ جائیں تو صرف اپنی زبان میں بات کرتے ہیں حالانکہ انہیں انگریزی پر عبور ہوتا ہے اور وہ انگریزی بخوبی بول سکتے ہیں لیکن نہیں بولتے کیونکہ یہ ان کے قومی تقاضے اور قومی پہچان کے خلاف ہے لیکن ہمارے صدر، وزیر اعظم، وزیر خارجہ جہاں جاتے ہیں انگریزی بولتے ہیں اور انہیں اردو بولنے کا کبھی خیال نہیں آیا۔

اس موقف پر اعتراضات کا جائزہ

ہم طوالت سے بچنے کی خاطر اگر مزید تفصیلات میں نہ بھی جائیں تو جن چند بڑے بڑے تعلیمی اور فکری نقصانات کا ذکر ہم نے کیا ہے وہی اس امر کے لیے کافی ہیں کہ ہم انگریزی ذریعۂ تعلیم سے توبہ کر لیں اور اردو ذریعۂ تعلیم کو اپنا لیں۔ لیکن ہمارے اس موقف پر جو پھبتی کسی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے تنگ نظر مولوی ہیں جو انگریزی کی اہمیت کو نہیں سمجھتے اور قوم کی ترقی کے دشمن ہیں کہ لوگوں کو انگریزی ذریعۂ تعلیم سے محروم کرنا چاہتے ہیں حالانکہ انگریزی کے بغیر نہ تو سائنس و ٹیکنالوجی میں پیش رفت کی جا سکتی ہے اور نہ قوم ترقی کر کے خوشحال ہو سکتی ہے۔

❁ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم انگریزی زبان سیکھنے سکھانے کے خلاف نہیں ہیں۔ انگریزی دنیا کی ایک اہم زبان ہے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے، تحقیق کرنا چاہتا ہے، دنیا کے ساتھ

کاروبار کرنا چاہتا ہے اسے انگریزی زبان ضرور سیکھنی چاہیے۔علماء کرام کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ اور کوئی انگریزی سیکھے یا نہ سیکھے، علماء کرام کو ضرور سیکھنی چاہیے کیونکہ جب تک وہ انگریزی نہیں سیکھیں گے مغربی فکر وتہذیب کو اس کے اصل مآخذ سے نہیں پڑھ سکیں گے اور جب تک وہ اعلیٰ درجے کی انگریزی نہ جانتے ہوں گے مغربی اعتراضات واشکالات کا ان کی زبان میں اعلیٰ علمی سطح پر جواب نہیں دے سکیں گے۔

❁ یہ محض غلط فہمی ہے کہ اچھی انگریزی لکھنے بولنے کے لیے انگریزی ذریعۂ تعلیم ضروری ہے۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ اردو میڈیم میں بھی اچھی انگریزی سیکھی اور سکھائی جاسکتی ہے اور انگریزی کو بطور زبان پڑھا کر اس میں مطلوبہ مہارت حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ ہمارے طریق تدریس کی ناکامی ہے کہ انگریزی پہلی سے لازمی ہے اور طالب علم بی اے تک اسے بطور لازمی مضمون پڑھتا ہے اور پھر بھی اپنی درخواست کے چند جملے صحیح انگریزی میں نہیں لکھ سکتا۔

خلاصہ یہ کہ ہمارے نظام تعلیم میں اس کی گنجائش ہونی چاہیے بلکہ اس کا موثر انتظام ہونا چاہیے کہ جو طالب علم انگریزی پڑھنا چاہتا ہو اسے قلیل عرصے میں انگریزی زبان میں مہارت حاصل ہو سکے لیکن اس کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو یا انگریزی پری سکول سے لے کر گریجوایشن تک لازمی مضمون ہو، جیسا کہ ہم نے وضاحت سے سطور بالا میں بتایا ہے۔

❁ ایک اور مغالطہ یہ دیا جاتا ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں پیش رفت کے لیے اور ترقی کرنے کے لیے انگریزی ناگزیر ہے۔ دنیا کے اکثر ملکوں میں اعلیٰ تعلیم ان کی اپنی زبانوں میں ہوتی ہے، اسی میں ریسرچ ہوتی ہے اور اسی کے ذریعے ایجادات کی جاتی ہیں۔ چین، جاپان اور جرمنی نے جو ترقی ہمارے دیکھتے کی ہے وہ اپنی زبان میں کی ہے۔ انگریزی کا اس میں کوئی دخل نہیں بلکہ وہ لوگ انگریزی بولنا ناپسند کرتے ہیں اور اپنی زبان میں ابلاغ پر اصرار کرتے ہیں۔ بحیثیت مسلمان امت ہماری زبان عربی ہونی چاہیے لیکن ہمیں اس کی بھی کوئی پروانہیں۔

ان غلاموں کا یہ کہنا ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

عصرِ حاضر میں اعلیٰ تعلیم (آخری قسط)

اعلیٰ تعلیم کے علمی پروگراموں کی صورتِ حال

اگر ہم درجہ بالا بحث کو ذہن میں رکھیں تو ہمیں اپنی جامعات کے موجودہ علمی پروگرام اوران کی سرگرمیاں کئی ایک نزاعات اور مسائل کا شکار نظر آتی ہیں۔ان مسائل کی اجمالی جھلک کچھ اس طرح ہے:

۱۔موزونیت (Relevance)

پوری دنیائے اسلام کی جامعات مغربی علمی روایات اور تنظیمی ڈھانچے پر قائم کی گئی ہیں۔حد تو یہ ہے کہ تجربے اور ضرورت کی بنیاد پر مغرب میں آنے والی تبدیلیاں بھی ہمارے جمود زدہ رویے کو نہیں توڑ سکیں۔ہماری جامعات کے علمی پروگرام، تدریسی نصابات اور تحقیقی منصوبے ہماری قومی ضروریات اور مسائل ومشکلات سے بہت کم تعلق رکھتی ہیں۔ان میں اکثر جامعات اوران کے علمی پروگراموں کی مثال ایک ایسے درخت سے دی جاسکتی ہے جو ایک خاص قسم کی موسمیاتی ماحول سے اکھاڑ کر کسی اور ماحول میں پہلے والے موسمیاتی ماحول کو مصنوعی طور پر پیدا کر کے اُگایا جائے اور وہ اس مصنوعی ماحول کے علاوہ کہیں اور اپنا وجود برقرار نہ رکھ سکے۔

۲۔کوالٹی (Quality)

ہماری جامعات کا ہر آنے والا دن معیارِ تعلیم وتحقیق کے لحاظ سے ایک زوال پذیر دن کے طور پر سامنے آ رہا ہوتا ہے۔فرسودہ نصابات، پرانی طرز کے علمی رطب ویابس سے بھری غیر ملکی کتابوں کی گرد آلود لائبریریاں، اپنی عمر کے ۱۶، ۱۸ یا بیس سال میں حاصل کیے ہوئے علم پر نازاں اور مزید کچھ پڑھنے سے مکمل طور پر فارغ اساتذہ کرام اور قومی سطح پر وقار سے

محروم یہ ادارے اور ان کے علمی کار پرداز... معیار تعلیم کا جو لائٹ ہاؤس تعمیر کریں گے وہ کسی صاحبِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔

۳۔ توازن (Balance)

ہماری اعلیٰ تعلیم اپنے علمی پروگراموں اور شعبہ جاتی ترجیحات کے لحاظ سے عدم توازن کا شکار ہے۔ مختلف Faculties اور ترجیحی فہرست میں ان کا مقام، خود فیکلٹی کے اندر مضامین وشعبہ جات کو دی جانے والی اہمیت، مختلف ڈگری پروگرموں میں پرچوں کی ترتیب اور ان کا نفس مضمون نصابی توازن کے بنیادی اصولوں سے بالکل آزاد ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اسلامیات میں ایم اے کرنے والے بعض خوتین وحضرات قرآن مجید ناظرہ پڑھنے کے قابل بھی نہیں ہوتے۔

۴۔ ربط (Integration)

مختلف علوم کے آپس میں Integration (مربوط ومدغم کرنے کا عمل) عصر حاضر کی علمی دنیا کا ایک مسئلہ ہے۔ تخصص (Specialization) کے موجودہ رجحان نے جس طرح انسان کو حکیمانہ بصیرت سے عاری کر دیا ہے اس کی مثال پہلے کے ادوار میں نہیں ملتی۔ ہوا بند خولوں میں بند انسانی اذہان کا کوئی بھی گروہ ملکی زندگی کے اجتماعی مسائل کو حل کرنے کی سعی میں نئے مسائل ہی پیدا کرتا ہے۔ یک رخا ذہن علم کو جہالت کی گہرائیوں میں لے جا رہا ہے۔ اس وقت زیادہ سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ علوم کی ارتباط (Integration) کی جائے اور حکیمانہ بصیرت کے حامل علوم وفنون کے ماہرین پیدا کیے جائیں، جو زندگی کے پیچیدہ مسائل حال کر سکیں۔

۵۔ تحرک (Dynamism)

ہماری جامعات اور اعلیٰ تعلیم گاہیں اس وقت علمی جمود کا شکار ہیں، تحقیق اور دریافت کا کام ہم نے دوسروں کے سپرد کر رکھا ہے۔ تحرک علمی تحقیق کی پیداوار ہوتا ہے جو ہماری جامعات میں ناپید ہے۔ اگر کہیں کوئی کام ہو بھی رہا ہے، تو اس کا تناظر قومی نہیں اور نتیجہ یہ ہے

کہ علمی تحقیقی نتائج ہمارے معاشرے میں جذب نہیں ہو پاتے بلکہ ان کو تخلیق کرنے والا ذہن متعلقہ تناظر اور ماحول کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے حتیٰ کہ ہم اس کے وجود سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور ذہانت کا یہ نکاس ہمیں پہلے سے بھی زیادہ علمی افلاس کا شکار کر دیتا ہے۔

۶۔ دورخا پن (Duality)

اسلامی دنیا کا عام طور پر اور پاکستان کا خاص طور پر یہ مسئلہ ہے کہ ہماری جامعات اور اعلیٰ تعلیم کے ادارے دورُخے پن کا شکار ہیں۔ دینی علوم کی جامعات اور عصر حاضر کی سیکولر جامعات اس کی واضح مثال ہیں لیکن اس سے بھی زیادہ ہولناک بات یہ ہے کہ یہ دونوں قسم کی جامعات اندرونی دورُخے پن کا شکار بھی ہیں۔ دینی علوم کی جامعات، اسلام کے آفاقی تصور اور فرقہ جاتی مسلک کی محدود سوچ کے درمیان دورُخے پن کے اس عفریت کی وجہ سے ان اداروں کے فارغ التحصیل نوجوان کسی مربوط علمی کردار کے حامل نہیں ہوتے۔

تجاویز اور سفارشات

اب تک کی جانے والی بحث ہمیں جامعات کے نصابات اور ان کی تعلیمی و تحقیقی پروگراموں کے لیے جو رہنمائی فراہم کرتی ہے اس کو پیش نظر رکھتے ہوئے تجاویز اور تبدیلی لانے کے لیے حکمت عملی کے طور پر ایک مختصر سا خاکہ پیش کیا جاتا ہے، جو کسی حد تک تفصیلی تعلیمی پروگرامز کی تیاری کے لیے گائیڈ لائن فراہم کرے گا:

۱۔ جامعات کا موجودہ انتظامی ڈھانچہ سول بیوروکریسی کی طرز پر قائم کیا گیا ہے۔ یہ انتظامی ڈھانچہ عملی سرگرمیوں، تحقیقی کاموں اور جدت پذیر خیالات کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے، اسے لازماً بدلا جائے۔ تحقیق و مطالعہ کی بنیاد پر ہی ایک نئے اور ترقی پسند انتظامی ڈھانچہ کی نشان دہی ہوسکتی ہے۔ البتہ اساتذہ کی انتظامی خودمختاری، تحقیقی و علمی کام پر مبنی ان کی ترقی کا خودکار نظام نیز کام چوری، تساہل اور بددیانتی پر جواب دہی کا خودکار انتظام اس کے لازمی جزو ہوں گے۔

۲۔ فیکلٹی کی موجودہ تقسیم اور ترتیب بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس تقسیم وترتیب میں Specialization کی بجائے Integration کو بنیاد بنایا جائے۔

۳۔ Discipline Oriented مضامین کی موجودہ تقسیم اور ان میں اختصاصی تعلیم کا انتظام شاید اب زیادہ Relevant نہیں رہا۔ ارتباط وادغام (Integration) کے تصور کو مدنظر رکھتے ہوئے کثیر شعبہ جاتی اور بین شعبہ جاتی اپروچ کو اپنایا جائے۔

۴۔ جاہلی بنیادوں پر استوار موجود تعلیمی نظام کی ساری عمارت اسلامی معاشرے کے لیے ناقابل قبول ہے۔ علوم وفنون کو اسلام کے تصور کے مطابق از سر نو ڈھالنے کی ضرورت ہے تاکہ فکری اور علمی آلودگی کا خاتمہ ہو۔ یہ ایک صبر آزما اور طویل المیعاد کام ہے۔ جس طرح مغرب نے مسلمانوں کی علمی روایت کو مغربیانے میں صدیاں لگائیں، اسی طرح مغربی علوم کو اسلامیانے میں بھی وقت لگے گا۔ موجود تیز رفتار علمی دور میں اس کے لیے شاید صدیاں تو نہیں البتہ کئی عشرے ضرور درکار ہوں گے۔ اس اہم کام کا آغاز تعلیم وتدریس کے عمل سے ہونا چاہیے۔

(الف) متعلقہ شعبہ میں اسلامی تصور اور جاہلی تصور کا تقابلی مطالعہ مثلاً معاشیات میں اسلامی معاشی تصورات اور دیگر جاہلی نظاموں کے معاشی تصورات کا تقابلی جائزہ ومطالعہ۔

(ب) قرآن وحدیث اور اسلامی علمی روایات کی روشنی میں متعلقہ مضمون/ شعبہ علم کے تصورات ونظریات اور عصر جدید میں ان کا اطلاق مثلاً عمرانیات کے مضمون میں اسلامی معاشرے کے خدوخال اور موجودہ دور میں اسلامی معاشرے کی تعمیر۔

۵۔ جامعات کا بنیادی کام مطالعہ وتحقیق، نئے علم کی دریافت اور اس کی ترویج ہے۔ اس لیے تمام گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ سطح کے تعلیمی پروگراموں میں ''ریسرچ ٹیکنیکس'' پر مبنی ایک ٹھوس علمی کورس سب طلبہ کے لیے لازمی ہو۔

۶۔ پوسٹ گریجوایٹ سطح پر تمام ڈگری پروگراموں میں ریسرچ پراجیکٹ ایک لازمی سرگرمی کے طور پر شامل ہونا چاہیے۔ اساتذہ کرام اپنے شعبۂ علم کے حقیقی اور عملی مسائل پر طلبہ

سے تحقیقی ریسرچ کرائیں۔

۷۔ علوم جدیدہ کو کم سے کم وقت میں اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے لازمی ہے کہ طلبہ اساتذہ اور محققین عربی زبان سے واقف ہوں تا کہ وہ اسلام کے جدید وقدیم منابع علم سے براہ راست استفادہ کرسکیں۔اس مقصد کے لیے جامعات کی داخلہ پالیسی میں عربی زبان کے پیشگی علم کو ترجیح دی جائے اور عربی زبان سے نابلد طلبہ ایک خاص مدت میں عربی کے ضروری علم کی کامیابی کے ساتھ تکمیل کرلیں۔

۸۔ مسلم معاشروں کی مقامی زبانوں خاص طور پر عربی، انڈونیشی، فارسی، بنگلہ، ترکی، اُردو، سواحلی اور ملائی زبانوں کو عملی طور پر ترقی یافتہ زبانیں بنانے کے لیے گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ سطح کے ہر طالب علم کے لیے غیر ملکی زبانوں کی کتب اور ریسرچ مضامین اپنی مقامی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے مقررہ صفحات کی لازمی ذمہ داری ہو۔ یہ کام طالب علم کے باقاعدہ علمی نصاب کا لازمی حصہ تصور کیا جائے۔

۹۔ ہر جامعہ میں Centre of Research for Islamization of Knowledge قائم کیے جائیں، جو علوم کی اسلام تشکیل نو کے لیے ایک اعصابی مرکز کا کام دیں۔

۱۰۔ مسلم امت کے زیر تسلط علاقوں کے مقامی وسائل اس قدر متنوع اور کثیر مقدار میں ہیں کہ اگر انہیں مناسب منصوبہ بندی کے ساتھ مسلم امت کی بہبود کے لیے استعمال کیا جائے تو ترقی اور مادی خود کفالت کا خواب جلد پورا ہوسکتا ہے۔اس مقصد کے لیے یونیورسٹیوں کی سطح پر خصوصی تحقیقی مراکز قائم کرنے کے ساتھ ساتھ ہر مضمون/ شعبہ میں مقامی وسائل کی تدریس کا خصوصی اہتمام ہونا چاہیے تا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد اس شعور وادراک کے ساتھ میدان عمل میں آئیں کہ انہوں نے اپنے مقامی اور علاقائی وسائل اور تجربات کو کام میں لانا ہے اور انہیں ترقی دینا ہے۔

۱۱۔ مسلم ممالک کے تحقیق وترقی (R&D) کے شعبوں کو ایک مربوط پالیسی کے تحت یونیورسٹیوں کے تدریسی اور تحقیقی شعبوں کے ساتھ منسلک کردیا جائے تا کہ اعلیٰ تعلیم کی کٹھالی

سے نکلنے والے لوگ قومی سطح پر دوطرفہ فائدہ کا باعث بنیں۔ایک طرف ملکی سطح پر R&D کی سرگرمیوں کے معاملات سے استفادہ کریں اور دوسری طرف اپنے تحقیقی منصوبے R&D کی غیر ملکی ضروریات کو مدنظر رکھتے ہوئے تشکیل دیں۔

۱۲۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ میں حکیمانہ بصیرت پیدا کرنے کے لیے پوری تدریس Problem Oriented ہو اور مذاکرے ومباحثے کے تدریسی طریق کار کو زیادہ سے زیادہ اختیار کیا جائے۔نیز تجربی تعلیم کو رواج دیا جائے۔

۱۳۔ تعلیمِ مسلسل اسلامی معاشرے کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے۔حصولِ علم مہد سے لحد تک گویا حدیث مبارک کا ایک واضح حکم ہے۔تمام جامعات میں Extension and Continuing Education کا ایک لازمی شعبہ ہونا چاہیے جو مختلف شعبوں میں تعلیم مسلسل کے پروگرموں کی منصوبہ بندی کرے اور انہیں روبہ عمل لائے۔

۱۴۔ خواتین کا معاشرہ میں خصوصی رول ہے۔اس رول کو بحسن وخوبی سرانجام دینے کے لیے انہیں ان کی ضروریات کے مطابق خصوصی تعلیم دی جانی چاہیے۔اس مقصد کے لیے علیحدہ خواتین یونیورسٹیاں اور علیحدہ نصابات ضروری ہیں۔

۱۵۔ یونیورسٹی اساتذہ کی علمی ترقی کے لیے نیز ملکی اور عالمی سطح پر ان کے شعبۂ علم میں ہونے والی تحقیقات سے روشناس کرانے کے لیے ہر سال ہائر ایجوکیشن کمیشن یا اسی نوعیت کے دوسرے اداروں کے زیر اہتمام سال میں کم از کم ایک ہفت روزہ سیمینار تمام مضامین اور شعبہ جات کے اساتذہ کے لیے منعقد کیا جائے۔

۱۶۔ پاکستان کی جامعات میں ہونے والی تحقیقات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے پاکستانی جامعات کے تحقیقی مختصرات (Abstracts) کے نام سے ہائر ایجوکیشن کمیشن ایک سالانہ رپورٹ کی اشاعت کا اہتمام کرے۔ دیگر مسلم ممالک بھی اسی طرح کے ریسرچ مختصرات کی اشاعت کا اہتمام کریں اور مسلم ممالک کی جامعات کے مابین علمی تبادلوں کا کوئی نظام قائم کیا جائے۔(بقیہ صفحہ نمبر:۲۶)

تعلیم و تربیت مدیر

لاجواب ''وِژن'' - باکمال ''وِزڈم''

بھوک لگی ہے تو ڈبل روٹی کیوں نہیں کھاتے؟

''جو سکول مغربی تہذیب کو فروغ دے رہے ہیں تو جن والدین کو یہ پسند نہیں وہ اپنے بچے اس سکول میں نہ بھیجیں''

چیف جسٹس آف پاکستان کا ارشاد

قارئین کرام! پاکستان کی عدالت عظمی میں آج کل پرائیویٹ سکولوں کی مہنگی فیسوں کے حوالے سے کیس زیر سماعت ہے۔ اس کی کچھ تفصیل (بحوالہ نوائے وقت لاہور ۸ مئی ۲۰۱۹ء) یہ ہے: ''دورانِ سماعت نجی سکولز کے طلبہ کے والدین بھی روسٹرم پر آ گئے اور موقف اپنایا کہ.... نجی سکولز میں مغربی طرز زندگی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ جس پر چیف جسٹس نے کہا: آپ کو ماحول پسند نہیں تو بچوں کا سکول بدل لیں۔ کسی نے زبردستی تو نجی سکول میں پڑھانے کا نہیں کہا''۔ چیف جسٹس نے مزید کہا: ''جن والدین کو ہالوئین، ویلنٹائن پارٹی اور کنسرٹ پسند نہیں تو وہ سکول چھڑوا دیں۔ عدالت نے سکولز کے نظام کو نہیں قانون کو دیکھنا ہے''۔

ہے نا لاجواب وِژن اور باکمال وِزڈم کہ بھوک لگی ہے اور روٹی نہیں ملتی تو ڈبل روٹی کیوں نہیں کھاتے؟ اصل سوال کہ روٹی کیوں نہیں ملتی گول ہو گیا۔ یہ ہے مغرب زدہ وکیلانہ اور چانکیانہ ذہانت اور فراست۔ دستور پاکستان ۱۹۷۳ء میں لکھا ہے کہ پاکستان ''اسلامی'' جمہوریہ ہو گا (دفعہ ۱)، اس کا دین اسلام ہو گا (دفعہ ۲)، یہاں کوئی قانون خلافِ اسلام نہیں بنایا جائے گا (دفعہ ۲۲۷)، لوگوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اسلامی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کر سکیں (دفعہ ۳۱)، پاکستان میں قرآن حکیم، اسلامیات اور عربی زبان کی تدریس ضروری ہو گی (دفعہ ۳۱(۲)) وغیرہ۔

لیکن عزت مآب چیف جسٹس صاحب کا ذہن اس طرح نہیں جاتا کہ ہمارے سکول مغربی تہذب کو کیوں فروغ دے رہے ہیں؟ یا یہ کہ وہ اسلامی تہذیب و اقدار کو فروغ کیوں نہیں دے رہے؟ یا یہ کہ دستور پاکستان کا تقاضا ہے کہ سکول اسلامی اقدار کی تعلیم دیں لہٰذا ہم سکول مالکان کو حکم دیتے ہیں کہ وہ مغرب کی لادین اور ملحدانہ تہذیب کو فروغ دینے والے

اقدامات فی الفور ختم کر دیں اور اپنے ہاں اسلامی اصول و اقدار کو فروغ دیں.... لیکن عزت مآب چیف جسٹس صاحب کا ذہن اس طرف نہیں جاتا بلکہ وہ سکولوں کو مذکورہ حکم دینے کی بجائے الٹا والدین کو مشورہ دیتے ہیں کہ جن والدین کو مغربی تہذیب کے یہ غیر اسلامی اصول و اقدار پسند نہیں وہ اپنے بچوں کو ایسے سکول نہ بھجوائیں۔ گویا ان سکولوں کو اجازت ہے کہ وہ مغربی تہذیب کی اقدار کو فروغ دیتے رہیں، انہیں ہم نہیں پوچھیں گے!.... کیوں نہیں پوچھیں گے؟ ہم نے اگر مزید سوچا اور لکھا تو ممکن ہے توہین عدالت کے مرتکب ٹھہریں لہٰذا خاموشی بہتر ہے۔

مہنگی فیسوں کے حوالے سے بھی جسٹس صاحب کا دھیان اس طرف نہیں جاتا کہ اسلامی روایت میں تعلیم فریضہ اور خدمت ہے، انڈسٹری اور کاروبار نہیں۔ یہ مغربی تہذیب اور اس کے سرمایہ دارانہ نظام کی کمرشل ازم اور میٹریل ازم ہے جس نے پاکستان جیسے اسلامی معاشرے میں بھی تعلیم کو مالِ تجارت بنا دیا ہے جس کا انسداد ضروری ہے جبکہ آئین پاکستان بھی بلا معاوضہ اور لازمی تعلیم کی تلقین کرتا ہے (دفعہ ۲۵ اے)۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔

بقیہ: عصرِ حاضر میں اعلیٰ تعلیم

۱۷۔ پوسٹ گریجویٹ سطح کے ہر طالب علم کے لیے لازمی ہو کہ وہ اپنے ملک میں ہونے والی اپنے شعبہ کی ریسرچ سے مکمل طور پر واقف ہو۔ اس بات کا اہتمام تدریسی پروگرموں اور جائزے کے نظام میں کیا جائے۔

۱۸۔ جامعات کے تعلیمی پروگراموں میں جو نئی چیزیں تجویز کی جارہی ہیں ان کے اثرات سے کماحقہٗ استفادہ کے لیے گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ سطح پر امتحانی نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ اس میں اندرونی جائزے کو زیادہ وقعت دی جائے اور اسے زیادہ سے زیادہ معروضی بھی بنایا جائے۔

۱۹۔ پوسٹ گریجوایٹ اور ڈاکٹریٹ کے پروگراموں میں یکسانیت کی بجائے تنوع کو ترجیح دی جائے تاکہ ہر جامعہ اپنے طور پر ''جدت اور تغیر'' کا ایک مرکز بن جائے۔

۲۰۔ اعلیٰ تعلیم کے پروگراموں میں تحقیق، دریافت اور ابلاغ کی صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرنے پر زور دیا جائے۔

تعلیم و تربیت مدیر

مَیں نے زندگی سے کیا سیکھا؟ (۲)

عادت کا غلام

مَیں نے انٹر کامرس ۶۴ - ۱۹۶۳ء میں جہلم سے کیا۔ وہاں ہمارے ایک استاد تھے پروفیسر عبدالرزاق صاحب جن کا خاندان مقبوضہ کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ میں آباد ہو گیا تھا۔ پروفیسر صاحب کسی حادثے یا ذہنی بیماری کی وجہ سے غیر متوازن ہو گئے تھے لیکن پرنسپل صاحب ہمدرد انسان تھے، انہوں نے کوشش کی کہ انہیں فوراً بیروزگار نہ کر دیا جائے اور ان کے ساتھ گزارا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن شرارتی لڑکے انہیں چھیڑتے اور انجوائے کرتے۔

ایک دن وہ علی الصبح ہماری کلاس میں آئے اور طلبہ کو کہا کہ وہ دوسرے کام چھوڑ کر ان کا تازہ مضمون سنیں جس کا عنوان تھا ''صبح اٹھنے کے نقصانات''۔ طلبہ نے کہا جناب صبح اٹھنے کے فائدے تو ہم نے سنے پڑھے ہیں لیکن یہ نقصانات والی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ سر کہنے لگے یہی تو میری انفرادیت ہے کہ وہ بات سوچتا ہوں جس کی طرف عام آدمی کا دھیان نہیں جاتا۔ اس کے بعد انہوں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور دو تین صفحے کا مضمون نکال کر سنایا۔ ان کے باقی دلائل تو اس وقت یاد نہیں، البتہ ایک بڑی دلیل ان کی یہ تھی کہ جو آدمی روز صبح اٹھے، اسے پھر صبح اٹھنے کی عادت پڑ جاتی ہے اور وہ سونا چاہے بھی تو نہیں سو سکتا لہٰذا یوں سمجھیے کہ آدمی اپنی عادت کا غلام بن جاتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات پیدا کیا ہے لہٰذا یہ اس کے شرف کے خلاف ہے کہ وہ اپنی کسی عادت کا غلام بن جائے لہٰذا صبح اٹھنے کو عادت نہیں بنانا چاہیے۔

انسان ہونے کے ناطے اور عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ مجھے کئی عوارض لاحق ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کبھی کبھار تھائی راڈ گلینڈ صحیح کام نہیں کرتا اور انرجی سپلائی اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ بیماری جو بھی ہو تکلیف وہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے عافیت و صحت طلب کرتا رہتا ہوں لیکن میرے لیے تھائی راڈ کی یہ تکلیف نا قابل برداشت ہوتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مَیں

اس کی وجہ سے مطالعہ نہیں کرسکتا اور لکھنے پڑھنے کا کام نہیں کرسکتا۔ اب ساری عمر کا معمول مطالعے کا ہے۔ دن ہو یا رات، سردی ہو یا گرمی، دفتر ہو یا گھر۔ مطالعہ کی عادت اتنی پختہ ہوچکی ہے کہ پروفیسر عبدالرزاق صاحب کے بقول مَیں اس عادت کا غلام بن چکا ہوں۔ اور جب مَیں مطالعہ نہیں کرسکتا تو سمجھ نہیں آتی کہ وقت کیسے گزاروں؟ ایک عجیب بے چینی، بے بسی اور بے آرامی کی کیفیت مسلسل طاری رہتی ہے اور دیگر ساری بیماریوں سے بڑھ کر یہ دن میرے لیے تکلیف دہ ہوتے ہیں اور میں اس بیماری سے اللہ تعالیٰ کی پناہ طلب کرتا رہتا ہوں۔

بقیہ: دہشت گرد کون - مغرب یا مسلمان؟

❁ جنوبی امریکہ میں پچاس ملین سے زائد انڈ نیز کو موت کے گھاٹ کس نے اتارا تھا؟ یقیناً مسلمانوں نے یہ جرم عظیم بھی نہیں کیا تھا۔

❁ ایک سواسّی ملین سے زائد افریقیوں کو کس نے غلام بنایا تھا اور انہیں اس بری طرح بھیڑ بکریوں اور جانوروں کی مانند بحری جہاز میں ٹھونسا تھا کہ ان میں سے لگ بھگ ۸۸ فیصد دورانِ سفر دم گھٹ کے مر گئے تھے جن کی لاشیں بے گوروکفن بحرالکاہل کی لہروں کے سپرد کردی گئی تھیں؟ یہ جرم بھی مسلمانوں نے نہیں کیا تھا۔

اگر یہ سب ظلم وستم اور کشت وخون اہل مغرب نے کیا تھا تو انہیں دہشت گرد کیوں نہ کہا جائے؟ اور جب ان میں سے کوئی بھی جرم مسلمانوں نے نہیں کیا تھا تو انہیں دہشت گرد کیوں قرار دیا جائے؟ کیا مغرب محض جھوٹے پروپیگنڈے سے پُرامن مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرنا چاہتا ہے؟ مسلمانوں میں سے اگر کچھ گروپ اہل مغرب کے ظلم وستم سے تنگ آکر اس کی مزاحمت کرنے لگ گئے ہیں تو اس کی وجہ مغرب کے ظلم وستم سے بچنا ہے نہ کہ اسلام کی اشاعت اور اس کی بھی بالواسطہ ذمہ داری اہل مغرب ہی پر عائد ہوتی ہے نہ کہ مسلمانوں پر۔

اسلام اور پاکستان

محمد عاصم حفیظ[۱]

مایوسی کی ضرورت نہیں

پاکستان میں دینی جدوجہد کی بڑی گنجائش ہے

ارض پاک میں آئے روز لبرل وسیکولر طبقے کی جانب سے مختلف قسم کی سرگرمیوں سے ایک عجیب سی فضا بن جاتی ہے۔تعلیمی اداروں کی ڈانس پارٹیاں ہوں۔کہیں ہولی منانا ہو یا میڈیا پر فحاشی وعریانی کا چلن۔عورت مارچ ہو یا سڑکوں پر لگے اشتہارات۔پیزا ڈیلیوری کے لئے خواتین کی بھرتی ہو یا ٹیکسی سروس کی خاتون ڈرائیورز۔ہر واقعہ اور ہر سرگرمی بے چین سا کردیتی ہے۔

لیکن ہمارے ہی معاشرے میں تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔یقین مانیں دینی دعوت وتبلیغ کی جتنی آزادی ارض پاک میں میسر ہے آپ اس کا تصور کسی عرب یا کسی دوسرے اسلامی ملک میں نہیں کرسکتے۔یہاں نہ تو خطبات جمعہ مانیٹر ہوتے ہیں اور نہ مساجد کی تبلیغی سرگرمیوں کے لیے اجازت لینا پڑتی ہے۔بڑے دینی سیمینارز اور اجتماعات کی اجازت لینا ضروری ہے لیکن یہ مراحل انتہائی آسانی سے طے ہوجاتے ہیں۔گھروں میں تبلیغی سرگرمیاں حتی کہ شادی بیاہ کی تقریبات میں بھی خطاب ودروس رکھے جاتے ہیں۔ایسا دیگر اسلامی ممالک میں ممکن نہیں۔حقیقت یہ ہے کہ ارض پاک میں دینی سرگرمیوں اور دعوت وتبلیغ کے لئے ایک کھلا میدان میسر ہے اور بہت سے دینی ادارے وتنظیمیں اس سے بھرپور فائدہ بھی اٹھا رہی ہیں۔ہر مسلک کی بڑی دینی جماعتوں کے ساتھ دین سکھانے کے لئے کئی جدید ادارے اور تنظیمیں بھی معاشرے میں اپنا اثرورسوخ بڑھانے میں کامیاب رہی ہیں۔جہاں ایک طرف بڑے تعلیمی اداروں میں مخلوط،ماڈرن اور لبرل سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے تو وہیں ایسی تنظیمیں اور ادارے بھی خوب پھلے پھولے ہیں جو نوجوان نسل کو دین کی طرف لارہے ہیں۔آپ فاسٹ،لمز جیسے ماڈرن پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں بھی اسلامک سوسائٹیز اور ان کے تحت

[۱] صحافی،لیکچرر جرنلزم وپی ایچ ڈی سکالر،ای میل: asimmas27@gmail.com

ہونے والے بڑے بڑے سمینارز دیکھ سکتے ہیں۔الہداء انٹرنیشنل،النور انٹرنیشنل،یوتھ کلب کے تحت ایلیٹ کلاس اور ایسا طبقہ جو صرف انگریزی سمجھتا، بولتا اور طرز زندگی اپنا تا ہے، ان کے لئے دعوتی سرگرمیاں منعقد کی جاتی ہیں۔مولانا طارق جمیل،ثاقب رضا مصطفائی،الشیخ قاری صہیب احمد میر محمدی، ڈاکٹر حماد لکھوی اور ایسے بے شمار نام ہیں جو یونیورسٹیوں اور کالجز کے بڑے اجتماعات میں مدعو کیے جاتے ہیں جہاں سیکڑوں کی تعداد میں نوجوان طلبہ وطالبات ان کا خطاب سننے کے لیے حاضر ہوتے ہیں۔اسی طرح خواتین کے لئے ڈاکٹر نگہت ہاشمی، ڈاکٹر کنول قیصر،سارہ چوہدری،جماعت اسلامی،الہداء،النور انٹرنیشنل سمیت دیگر کئی تنظیموں کے بڑے بڑے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں۔ارض پاک میں ہر طبقے کے لئے دینی رہنمائی کا بھرپور انتظام موجود ہے۔ہر مسلک کے بڑے بڑے مدارس دینی تعلیم کے لیے سرگرم ہیں۔ دینی جماعتوں کے تحت تبلیغی پروگرامز بڑے اجتماعات اور دروس منعقد ہوتے ہیں۔ان کی یوتھ، اساتذہ کرام، وکلاء،خواتین اور دیگر طبقات کے لیے الگ الگ تنظیمیں موجود ہیں۔ ہمارے ہاں دینی سرگرمیوں کے لئے فنڈز دینے کا رجحان موجود ہے اور اسی سے یہ سب ممکن ہو پاتا ہے۔

الحمدللہ!ارض پاک میں دعوت وتبلیغ کی آزادی دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ ہے تو پھر پریشانی کیسی؟۔ضرورت اس چیز کی ہے کہ گلوبل ویلیج بنتی اس دنیا میں سوشل میڈیا کی یلغار اور سماجی تبدیلیوں پر نظر رکھی جائے۔اعتراضات،تشویش،مایوسی اور بددلی پھیلانے کی بجائے اپنے کام کو بڑھالیا جائے۔دینی طبقہ اپنے وسائل اور افرادی قوت کو بہتر انداز میں استعمال کرے۔بدلتے حالات کے تحت منصوبہ بندی اور انداز بدل لیے جائیں۔اس گلوبل ویلیج میں دعوت دین کے انداز سیکھے جائیں۔جہاں ممالک ملٹی نیشنل کمپنیوں کے محتاج ہوں، ملک بیرونی قرضوں پر چلایا جارہا ہو، عالمی معاہدے ہوں اور بیرونی دباؤ ہو تو وہاں ماڈرن کلچر کو بزور طاقت روکا نہیں جاسکتا،حکمت عملی تبدیل کرنا پڑتی ہے۔اگر لبرل ومغرب زدہ طبقہ اپنا پیغام پھیلا رہا ہے تو آپ کو کس نے روکا ہے؟ چند سو کا عورت مارچ ہوتا ہے تو پریشانی کیسی؟ دینی جماعتیں ہزاروں کی خواتین کانفرنس منعقد کر کے اپنا پیغام پھیلا سکتی ہیں۔حجاب ڈے

منایا جاتا ہے۔میڈیا سیکولر سہی لیکن دینی پروگرامز ہوتے ہیں، دینی سکالرز کو بلایا جاتا ہے۔ سوشل میڈیا اور اپنے چینلز بنانے کے مواقع موجود ہیں، آپ انہیں استعمال کریں۔ دراصل دور حاضر میں معاشرے کے ساتھ چلنا پڑتا ہے۔آپ معاشرے کے کسی بھی طبقے کو بے دین، ملحد یا کسی بھی ٹیگ کے تحت نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اگر ثقافتی یلغار آپ کے گھروں پر حملہ آور ہے تو آپ کو مقابلہ کرنا سیکھنا ہوگا۔ملٹی نیشنل کلچر کو سمجھنا، مارکیٹ کے اصولوں کو بدلنے کی جد وجہد کرنا، حکومتی مجبوریوں کا ادراک ہونا، عالمی سیاست پر نظر رکھنا، ماڈرن ازم اور الحاد کی وجوہات پر نظر رکھنا، فحاشی وعریانی کو بے نقاب کرنا، میڈیا سے نفرت کی بجائے اس کی اصلاح اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا، جدید ذہن سے مکالمے کے لئے سکالرز تیار کرنا، سوشل میڈیا پر دعوتی اسلوب اپنانا اور بہت کچھ کرنا ہوگا۔ اپنا کام اور لگن بڑھانا ہوگی۔ معاشرے کے بدلتے رجحانات کو سمجھنا ہوگا۔صرف فتووں، اظہار نفرت اور کنارہ کشی سے کام نہیں چلے گا۔آپ کا کام کوئی دوسرا طبقہ نہیں کرے گا اور نہ ہی امید رکھنی چاہیے۔اگر یہ سوچ رکھا ہے کہ میڈیا خود بخود ہی اسلامی روایات کا پابند بن جائے، ملٹی نیشنل ادارے اپنی سوچ دینی کرلیں تو اسے صرف ایک خوش فہمی ہی قرار دیا جاسکتا ہے، ایسا نہیں ہوتا۔اگر اپنا کلچر بچانا ہے، دینی روایات کی پاسداری کرنی ہے تو اپنا کام خود ہی کرنا ہوگا اور میدان عمل میں نکلنا ہوگا۔

یقین مانیں ارض پاک میں دین کے حوالے سے تعلیم وتبلیغ اور سرگرمیوں کی جس قدر آزادی موجود ہے آپ بہت سے دیگر اسلامی ممالک میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اگر اسلامی قانون کی خواہش ہے تو پہلے معاشرے کو قائل کرنا ہوگا۔اگر آپ کو لگتا ہے کہ دینی طبقے کو کارنر کیا جارہا ہے تو اپنے لیے نئی حکمت عملی بنانی ہوگی۔ راستہ بدل کر، طرز عمل کی تبدیلی اور مختلف طریقۂ کار کے ذریعے آپ اپنی منزل حاصل کر سکتے ہیں۔ راستے موجود ہیں، مواقع ڈھونڈے جاسکتے ہیں۔اپنا کام بڑھایا جاسکتا ہے اور سمت کا درست تعین کرکے منزل حاصل کی جاسکتی ہے۔ مایوسی نہیں پریشانی نہیں۔بس عزم جواں رکھیں یہ اپنا وطن ہے۔ یہ کلمہ طیبہ کی بنیاد پر بنا پاکستان ہے۔

اسلام اور پاکستان پروفیسر طارق بٹ

معذرت کے ساتھ

کیا دینی قوتیں بکاؤ مال ہیں؟

عالمی سطح پر اعلیٰ سیاسی حلقوں میں یہ بات کئی دفعہ زیر بحث آ چکی اور معروف ہے کہ داعش والقاعدہ میں امریکی سی آئی اے گھسی ہوئی ہے اور انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ طالبانِ پاکستان کے حوالے سے پاکستان میں سیاسی، دینی اور صحافتی حلقے جانتے ہیں کہ ان کی پشت پر امریکی و بھارتی ہیں۔ پاکستان میں یہ بات بھی زبان زد عام ہے کہ جماعۃ الدعوۃ اور تحریک لبیک کے پس پردہ اسٹیبلشمنٹ ہے۔ دینی قوتوں پر عموماً الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ اسٹیبلشمنٹ کی پیداوار ہیں یا ان سے ملی ہوئی ہیں۔ یار لوگ ایم ایم اے (MMA) کو طنزاً ''ملا ملٹری الائنس'' کہتے ہیں۔

اب تصویر کا دوسرا رُخ دیکھیے کہ شام وعراق میں داعش اور القاعدہ کو مار مار کر ان کا بُھرکس کس نے نکالا؟ امریکیوں نے۔ طالبان کے بیت اللہ محسود اور ملا فضل اللہ کو کس نے مارا؟ امریکیوں نے۔ تحریک لبیک کے لیڈروں کو جیل میں کس نے ڈالا اور جماعۃ الدعوۃ (لشکر طیبہ) کو خلافِ قانون کس نے قرار دیا؟ پاکستانی حکومت نے۔

مطلب یہ کہ اسلام اور جہاد کے نام پر کام کرنے والی دینی قوتوں کو عالمی اور پاکستانی سطح پر پہلے پالا پوسا اور پھر ان کو کچلا اور ہرایا۔ کس نے؟ عالمی اور پاکستانی ایجنسیوں نے! تو کیا ذہن میں اس سوال کا پیدا ہونا فطری اور منطقی نہیں ہے کہ کیا دینی قوتیں بکاؤ مال ہیں؟ ان کا ایمان، اخلاق اور فراست کہاں ہے؟ ایجنسیاں انہیں کیوں استعمال کر لیتی ہیں؟ اور استعمال کرنے کے بعد ٹائلٹ پیپر کی طرح کیوں پھینک دیتی ہیں؟

یادش بخیر! ہماری ان سطور کا محرک یہ خبر بنی کہ علماء کے ایک اعلیٰ سطحی نمائندہ وفد نے پچھلے دنوں پہلے آرمی چیف سے ملاقات کی اور پھر وزیر اعظم سے ۲/اپریل کو (خدا کا شکر ہے کہ یکم اپریل نہ تھی ورنہ لوگ اسے ''یکم اپریل فول'' سمجھتے) ملاقات کی اور امریکی و بھارتی دباؤ پر پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کو جو 'نیشنل ایکشن پلان' اچانک یاد آ گیا ہے اور دینی قوتوں کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا ہے، علماء کرام کی پکڑ دھکڑ جاری ہے۔ مدرسے بند کیے جا رہے ہیں، لاؤڈ سپیکر

اتارے جارہے ہیں....تو علماء کرام کے اس وفد نے میڈیا کے مطابق وزیراعظم کو اپنی حمایت کا یقین دلایا۔

ہم نے اگر ایک ایک کرکے ان حکومتی اور اسٹیبلشمنٹ کے حامی علماء کرام کے نام لکھے جو 'دفاع پاکستان کونسل' سے لے کر 'پیغام پاکستان' اور 'خاندانی مصوبہ بندی' کے پروگراموں میں، رویت ہلال کمیٹیوں میں، محکمہ اوقاف میں، اسلامی نظریاتی کونسل میں، وفاقی شرعی عدالت میں، علماء بورڈ اور امن کمیٹیوں میں آج تک سرگرم رہے اور اب بھی ہیں اور ان کے علاوہ بھی بے شمار علماء ایسے ہیں جو ایجنسیوں کے تنخواہ دار ہیں (جیسا کہ ایک دفعہ ڈاکٹر مرتضیٰ ملک مرحوم نے علماء کی ایک مجلس میں سرِ عام کہا تھا کہ ان کے پاس ایسے علماء کی فہرستیں موجود ہیں) تو بہت سی جبینیں شکن آلود ہوجائیں گی اور بہت سے ہاتھ ہمارے گریبان کی طرف لپکیں گے لیکن سوال تو اپنی جگہ باقی رہے گا کہ ہماری دینی قوتیں بکاؤ مال کیوں ہیں؟ کیا مارکیٹ میں سیل لگی ہے کہ سستی قیمت پر بھی دستیاب ہیں؟

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنایئے۔

زرِاعانت سالانہ **500** روپے تاحیات **10,000** روپے

نام...

پتہ...

.........................فون.........................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوایئے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

اسلام اور پاکستان مدیر

پاکستانی معاشرے میں ابلیسیت کہاں سے آ رہی ہے؟

گدھا ایک درخت سے بندھا ہوا تھا۔ شیطان آیا اور اس نے گدھے کی رسی کی گرہ ڈھیلی کر دی۔ گدھا آزاد ہو کر قریبی کھیت میں گھس گیا اور چرنا شروع کر دیا۔ کھیت کے مالک کسان کی بیوی نے دیکھا کہ گدھا ان کی فصل اُجاڑ رہا ہے تو اسے غصہ آیا۔ خاوند کی بندوق پکڑی اور گدھے کو ڈھیر کر دیا۔ گدھے کے مالک نے فائر کی آواز سنی تو بھاگا۔ جا کر دیکھا تو گدھا مرا پڑا تھا۔ اس نے ڈب سے پستول نکالا اور کسان کی بیوی کا خاتمہ کر دیا۔ کسان کو پتہ چلا تو وہ بھی دوڑا۔ جا کر دیکھا تو بیوی مقتول پڑی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ گدھے کے مالک کو گولی مار دی۔ گدھے کے مالک کے بیٹے کو خبر ملی تو وہ بھی دوڑا آیا دیکھا تو ابّا مردہ پڑا ہے۔ اس نے غصے میں آ کر کسان اور اس کے بیٹے پر فائر کھول دیا۔ کسان کے رشتہ داروں کو خبر ہوئی تو وہ بھی جمع ہو گئے اور گدھے کے مالک کے گھر پر چڑھائی کر دی۔ جو بھی سامنے آیا اسے بھون ڈالا اور مکان کو آگ لگا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

شیطان سے پوچھا گیا کہ یہ سب تمہارا کارنامہ ہے؟ اس نے مسکین صورت بنا کر کہا: دہائی خدا کی! مَیں نے کچھ بھی نہیں کیا۔ مَیں نے تو بس گدھے کی گرہ ذرا ڈھیلی کی تھی۔

آپ کیا سمجھے؟ پاکستان میں یہ جو قتل وغارت، چوری، ڈاکے، فراڈ، رشوت، کرپشن، فحاشی، عریانی، زنا، شراب، جوا.... یہ سارا فساد جو ہر طرف پھیلا ہوا ہے اس کا ذمہ دار کون ہے؟ بات بس اتنی ہے کہ شیطان نے کچھ گدھوں کے نفس کی گرہ ڈھیلی کر دی ہے اور سارا فساد یہی گدھے پھیلا رہے ہیں۔ یہ سیاست میں بھی ہیں۔ عدلیہ میں بھی ہیں اور بیوروکریسی میں بھی۔ یہ صحافت میں بھی ہیں اور ادب میں بھی۔ یہ یونیورسٹیوں میں بھی ہیں اور مدارس ومساجد میں بھی۔ پڑھیے! نعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم۔

اسلام اور پاکستان مدیر

عمران حکومت کی اسلام مخالف کاروائیاں

اے بادِ صبا! ایں ہمہ آوردۂ تست

اسلام مخالف اقدامات کے حوالے سے عمران خاں اور ان کی حکومت کے ابتدائی آٹھ ماہ کے ''کارنامے'' یہ ہیں: ❁ جماعۃ الدعوۃ پر پابندی، تحریک لبیک کو پابند سلاسل کرنا اور مولانا مسعود اظہر کو اقوام متحدہ سے دہشت گرد قرار دلانا۔ ❁ دینی مدارس کے خلاف گھیرا تنگ کرنا اور یکساں نصابِ تعلیم اور انہیں مرکزی تعلیمی دھارے میں لانے کے نام پر انہیں جدید مغرب زدہ نظام تعلیم میں مدغم کر کے انہیں بتدریج غیر موثر اور ناکام بنانا۔ ❁ دینی جماعتوں میں سے واحد پارلیمانی قوت جمعیت علماء اسلام اور اس کے سربراہ مولانا فضل الرحمن کو نشانۂ استہزا بنانا۔ ❁ نیشنل ایکشن پلان کی تنفیذ کے نام پر اہل دین کی پکڑ دھکڑ اور ان کے خلاف کریک ڈاؤن۔ ❁ فواد چودہری کے اسلام مخالف بیانات خصوصاً رویت ہلال کمیٹی اور علماء کا مضحکہ اڑانے کا کارنامہ۔ ❁ خواتین ڈے پر مغرب زدہ اور مغرب کی فنڈڈ این جی اوز کی ہرزہ سرائیوں کی خاموش حمایت۔ ❁ حج کو مہنگا کرنا۔ ❁ قومی اسمبلی کے ارکان کا ایک ہندو رکن اسمبلی کی طرف سے شراب پر پابندی کے بل کی علی الاعلان مخالفت کرنا۔ ❁ سندھ اسمبلی میں ایک ہندو رکن اسمبلی کی طرف سے سندھ میں ہندوؤں کے اسلام قبول کرنے کے خلاف بل پیش کرنا۔ ❁ سینٹ میں چھوٹی عمر کی لڑکیوں کی شادی پر سزا کا بل پاس کرنا۔ ❁ قادیانیوں کو حکومت میں شامل کرنے کی کوشش کرنا۔ ختم نبوت پر مضمون کا نصاب سے اخراج۔

ہم اس پر تبصرہ کرنے کی بجائے دو تبصروں کا خلاصہ قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں: **ایک:** کراچی کے بزرگ اسلامی دانشور اور ماہر معاشیات ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری صاحب نے تفصیلی تجزیے کے بعد رائے دی ہے کہ عمران خان پاکستان میں دینی قوتوں کو کچلنے میں وہی کردار ادا کریں گے جو جمال عبدالناصر نے بیرونی قوتوں کی اکساہٹ پر مصر میں ادا کیا تھا۔ **دوم:** جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عمران خان یہودی ایجنٹ ہے وہ ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم کی ایک تقریر کا وڈیو کلپ اور حکیم محمد سعید مرحوم کی تحریر کا ایک اقتباس پیش کر رہے ہیں جس میں انہوں نے عمران خان کو یہودی ایجنٹ کہا ہے۔ ان اصحاب کا استدلال یہ ہے کہ یہ دونوں مرحوم بزرگ مخلص بھی تھے اور صاحب فراست بھی۔ وہ عمران خان کے سیاسی حریف بھی نہ تھے کہ جھوٹ بولتے یا خواہ مخواہ الزام تراشی کرتے لہٰذا قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید۔

اسلام اور پاکستان

صاحبزادہ ڈاکٹر انوار احمد بگوی[1]

'انصاف کے ساتھ ناانصافی'

آسیہ مسیح کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ درست تھا

مذہبی جماعتوں اور مدیر البرہان کے موقف پر نقد

البرہان کے بعض شماروں اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۱۸ء اور جنوری ۲۰۱۹ء میں آسیہ مسیح کیس میں عدالت عظمیٰ کے فیصلے پر تسلسل کے ساتھ تنقید شائع ہو چکی ہے۔ اس حوالے سے چند گزارشات ارسال ہیں تاکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی قارئین کے سامنے رہے۔

دنیا کا کوئی بھی سیاسی نظام ہو، کیسا ہی معاشرہ ہو، انصاف کے حصول کے لئے نظامِ عدل میں بنیادی ضرورت مدعی کے لئے ثبوت دعویٰ اور مدعا علیہ کے لئے اپنے دفاع اور بے گناہی ثابت کرنے کا حق ہے، اگر ان میں سے کوئی ایک حق بھی متاثر ہو تو کہا جاسکتا ہے کہ انصاف ہو نہیں رہا۔ اس کلیے کے تحت انصاف ہوتا نظر آنا چاہیے۔ مگر اس کلیے سے عمومی انحراف کی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کا نظامِ عدل ۱۹۷۳ء کے آئین اور بعد کی ترامیم کے باوجود اپنے ماتحت شعبہ ہائے عدل کو نہیں بدل سکا۔ وہاں عدل کی نہیں وکیلوں اور ریڈروں کی عملداری ہے۔ وہاں انصاف خریدنا پڑتا ہے، جتنا بڑا وکیل اتنا بڑا انصاف۔ اعلیٰ عدالتیں اسی آئین کے تحت اس کی تشریح و توضیح کی مجاز ہیں لیکن وہ اپنی آئینی ذمہ داری کے برعکس اپنے ماتحت عدالتوں اور عدالتی نظام کو عدل و انصاف کے تقاضوں کے مطابق نہیں ڈھال سکیں، اس صریح ناانصافی اور غیر عادلانہ طریقے کی مثالیں آئے روز سامنے آتی رہتی ہیں۔ ایک شریف پاکستانی جس طرح تھانوں اور سرکاری دفتروں میں جانے سے گریز کرتا ہے، اسی طرح وہ عدالت یا کچہری میں جانے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اُسے وہاں سے بے لاگ اور عادلانہ انصاف نہیں ملتا، ذلت، رسوائی اور بے عزتی حاصل ہوتی ہے۔ اس مایوس کن صورتحال کے باوجود ہر پاکستانی کے لئے اہم اور اُس کا مداوا یہی عدالتیں ہیں، وہ اور کہاں جائے؟ ممکن ہے کہ بہت

---

[1] چیف ایگزیکٹو/ ایم ایس منصورہ ہسپتال لاہور

سوں کو انصاف نہ ملتا ہو، لیکن ایک بڑی تعداد کسی نہ کسی حد تک ضرور عدلیہ کے نتائج سے متاثر ہوتی ہے۔

نظام عدل کی خرابی پر سیاست دان، عدالتوں کے جج اور وکیل، میڈیا، دانشور وغیرہ اپنے اپنے انداز میں اور اکثر کسی مصلحت کے مطابق تنقید کرتے رہتے ہیں لیکن ایک اہم پہلو جس پر بہت کم توجہ مرکوز ہوئی ہے وہ عدالت کی مقدمہ باز پارٹیوں کا بار بار حق اپیل اور مختلف سطح کی عدالتوں کے متضاد فیصلے ہیں۔ یہ دونوں کام اتنے تواتر سے اور دھڑلے سے ہو رہے ہیں کہ اب معاشرہ ان کا عادی ہو گیا ہے۔ کیسوں کی بار بار شنوائی اور نت نئے فیصلوں پر حیرت ہوتی ہے اور نہ انجام پر کوئی پریشانی۔ اعلیٰ عدالتوں کے نزدیک غالباً ان کا شوقِ سنوائی اور جذبۂ اختیار کی وجہ سے ہر درخواست اور ہر معاملہ گویا بنیادی حقوق کی خلاف ورزی ہے جس میں دونوں عظمیٰ اور عالیہ کی مداخلت از حد ضروری ہے۔ جیسے عدالتوں نے سماعت نہ کی تو اسلام کے ساتھ آئین بھی خطرے میں پڑ جائے گا اور ملک کو کسی یورپی یا امریکی سیاسی یا معاشی قدغن کا سامنا کرنا پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ عدلیہ کا غیر ضروری بلکہ نامناسب تجاوز کار ہے اور دوسروں کے کاموں میں مداخلت بے جا اور اس شوقِ کشور کشائی نے سرکاری اداروں کو بدحواس بلکہ مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ عدلیہ کے مسالے دار ریمارکس میڈیا کا من بھاتا کھابا ہے اور ہر معاملے میں انگریزی ناگ گھسیڑنا ججوں کی شاید من پسند خدمت!

آسیہ مسیح کیس ۔۔۔ جب تک مدیر البرہان کے فکر کے مطابق عدالتوں میں یہ کیس چلتا رہا اور فیصلہ اُن کے مزاج کے مطابق ہوتا رہا تو اُن کو عدل وانصاف کی فرمانروائی نظر آئی۔ جب ملک کی سب سے بڑی عدالت نے مدیر البرہان کی فکر اور مزاج کے برعکس ایک مختلف مگر متفقہ فیصلہ سنایا تو اُنہوں نے عدالت اور اس کے ججوں کو وہ بے نقط سنائیں اور اُن کے علم کی وہ بھد اُڑائی جو ایک کم پڑھا لکھا کہنے کی جسارت نہیں کرتا۔ شاید وہ اتنا بہادر نہیں ہوتا، شاید اس کے پاس اپنا رسالہ نہیں ہوتا۔ اول تو کسی بھی اعلیٰ عدلیہ کا جج قابل احترام ہے، وہ بھی ایک اولی الامر ہے، تضحیک اور تمسخر کا سزاوار نہیں۔ مرضی کا فیصلہ نہ آنے سے آپ اگر ججوں کو توہین آمیز نام دیں گے تو عام آدمی جج کی ماں بہن ایک کر دے گا۔ جب آپ دوسروں کے لئے حق اختلاف مانتے ہیں، عام معاملات میں بھی نظائر وشواہد پر یقین رکھتے ہیں تو عدالتوں

کے ججوں کو جو خود بھی وکیل ہیں اجازت دیں کہ وہ شواہد پر غور کریں اور اپنی صوابدید کے مطابق فیصلہ دیں۔مختلف معاملات میں ہمارے فقہاء کی مثبت منفی،متضاد بلکہ مختلف آراء موجود ہیں لیکن ججوں کی طرح اُن کو تو ہم گردن زنی قرار نہیں دیتے۔اُن کا حق اختلاف تسلیم کرتے ہیں اور فقہاء کے متعارض فیصلوں کو بے کم وکاست تسلیم کر لیتے ہیں۔

مدیر البرہان کے نزدیک بھلے سے آسیہ کیس سے اسلام خطرے میں پڑ گیا ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ سپریم کورٹ آف پاکستان کے اس فیصلے نے پاکستان کے عوام وخواص میں شدت پسندی اور انتہا پرستی کے سامنے ایک روک لگائی ہے،دنیا بھر میں ملک اور قوم کا امیج بہتر بنایا ہے، مسلمانوں کے اندر اعتدال،توازن اور انصاف کے پہلو کو اُجاگر کیا ہے۔سروے کروالیں آسیہ کیس کے حوالے سے مدیر البرہان کی متشددانہ رائے سے بہت کم لوگ اتفاق کریں گے سوائے چند جذباتی اور سیاسی مذہب داروں کے۔ویسے مدیر البرہان پروفیسر اور مصنف تو ہیں مگر وکیل اور جج نہیں ہیں۔وہ معلم ہیں فقیہ اور جیورسٹ نہیں ہیں۔اُن کے تخصص کے باعث کوئی غیر مدرس اس طرح بات نہیں کر سکتا جس طرح ایک تربیت یافتہ تجربہ کار اُستاد کرتا ہے۔ ایسے معاملوں میں بھی علم کو وزن ہے۔

آسیہ پر اسلام کے اجارہ دار مولویوں نے کیا طوفان نہیں مچایا۔اس سے کونسی حرمت محفوظ اور کون سا جذبہ ایمانی تقویت پذیر ہوا؟لوگوں کے ایمان اور حُبِ رسولؐ میں کتنے فیصد اضافہ ہوا؟ملک وقوم کا امیج کتنا اُجلا ہوا۔اب تحریک حرمت کے وہ مجاہدین چونکہ''اندر''ہیں تو اسلام بھی قائم ہے،انصاف بھی موجود ہے اور معاشرہ بھی پرسکون ہے۔آسیہ کو اگر پھانسی مل جاتی تو دنیا میں انصاف کا اتنا بول بالا نہ ہوتا جتنا اب ہوا ہے۔البتہ پاکستانی مسلمانوں اور خود اسلام کا امیج اور خراب ہوتا۔کون جانے اس فیصلے سے کتنے غیر مسلم اذہان اسلام کی طرف راغب اور قلوب متاثر ہوئے۔اسلام کی توقیر میں کتنا اضافہ ہوا۔ایک بے گناہ کی بریت سے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بلند ہوا۔اسلام ایک زندہ دین ہے۔آج اس دین کے فروغ وابلاغ میں ایک رکاوٹ اس کو ماننے والے مسلمانوں کا کردار،اخلاق اور اُن کی عملی زندگی ہے۔

ہو یہ رہا ہے کہ دیوانی اور فوجداری کا مقدمہ چالان مکمل ہو کر عدالت میں جاتا ہے،

مہینوں برسوں کی کھچائی کے بعد جو وکیلوں کی مرہون منت ہے، بہزار دقت جج فیصلہ دیتا ہے۔ اس کے بعد ایک فریق فیصلے کے خلاف اپیل میں چلا جاتا ہے۔ پہلے جیسی اگلی عدالت میں پھر آوازیں پڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ عدالتیں بھی سیاسی اور میڈیا پسند موضوعات پر جلد فیصلے دیتی ہیں البتہ دوسرے مقدمات میں طویل ساعتوں کے بعد پہلے سے مختلف ایک دوسرا فیصلہ آتا ہے۔ جس پارٹی کے خلاف فیصلہ آئے وہ اس سے اگلی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عدالتوں میں انصاف کے نام پر سیڑھی اور سانپ کا کھیل جاری ہے۔ پیشی در پیشی، فیصلے پر فیصلہ، ایسے ہی جیسے معالج نسخے پر نسخے لکھتے رہیں تو آخر میں مریض کا حشر کیا ہوگا اور مرض کیا قیامت ڈھائے گا؟ چھوٹی عدالت ،ایڈیشنل عدالت، سیشن کورٹ، ہائی کورٹ سنگل ،ڈبل یا فل بینچ، پھر سپریم کورٹ کا سنگل ،ڈبل یا فل بینچ اور بعض معاملات میں صدرِ پاکستان کے اختیارات اور آئینِ پاکستان سے استثنیٰ۔ الامان! بظاہر یہ کھیل پیسے کا کھیل ہے۔ اگر وقت اور پیسہ وافر ہے تو عدالت عدالت کھیلتے جایئے۔ جہاں اصل کھلاڑی عدالت کے جج اور فریقین کے وکیل ہوتے ہیں۔ کھیل کا سب سے دلچسپ حصہ ان عدالتوں کے فیصلے ہوتے ہیں جو ہر سطح پر بدلتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ سپریم کورٹ کے بینچ کا ایک فیصلہ، بعد میں دوسرا بینچ پہلے فیصلے کو بدل دیتا ہے بشرطیکہ چیف جسٹس ریٹائر ہو چکا ہو۔ مقدمے کے فریقین، حالات، واقعات، دستاویزات، بیانات وغیرہ غرض فائل سب کچھ وہی ہوتا ہے جو پہلی درخواست یا FIR سے شروع ہوتا ہے لیکن ہر وکیل ہر جج ہر سطح پر انہی کاغذوں میں سے نت نئے فیصلے برآمد کر لیتے ہیں۔ نجانے اُن کی نگاہیں کہاں سے نئے مطالب اور نئے مفاہیم ڈھونڈ لیتی ہیں۔

کیا ریاست مدینہ کے اور بنواُمیّہ کے خلفاء نے اس طرح کا نظام عدل قائم کیا تھا جہاں اپیل کے بعد اپیل در اپیل۔ ہر بار نیا اور پہلے سے مختلف فیصلہ۔

کیا عدل اسلامی کی تاریخ میں ایک معاملے پر اتنے متضاد، متنوع اور متعارض فیصلے ہوتے رہے ہیں؟ کیا ایسا نظام عدل دنیا کے مہذب اور معقول معاشرے میں لائق ستائش یا قابلِ عمل ہونا چاہیے؟

بیّنو وتوجرو [حسبِ مقالہ نگار]

اسلام اور مغرب مدیر

ایران پر ممکنہ امریکی حملہ اور پاکستان کا مستقبل؟

امریکہ اور عالمِ اسلام

اگر امریکہ نے ایران پر حملہ کر دیا تو اس کے پاکستان اور عالم اسلام کے مستقبل پر شدید اثرات ہوں گے۔ اگر یہ حملہ ہوتا ہے تو اس سے یہ بات ایک دفعہ پھر کنفرم ہو جائے گی کہ مغرب نے یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ عالم اسلام میں سے ہر اہم ملک کو باری باری تاراج کرے گا۔عراق، افغانستان اور لیبیا تباہ کیے جا چکے، اب دوسروں کی باری ہے۔سوال یہ ہے کہ کیا عالم اسلام اور اس کی کوئی تنظیم اس معاملے پر غور کر رہی ہے کہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹا جائے؟ اگر امریکہ ایئر سٹرائک پر بس نہیں کرتا اور ایران کو ایک طرف عراق سے اور دوسری طرف پاکستانی بلوچستان کی طرف سے گھیرنے کی کوشش کرتا ہے تو پاکستان کے لیے بظاہر دو آپشنز ہیں:

ایک: یہ کہ پاکستانی اسٹیبلشمنٹ پہلے کی طرح امریکہ کی علانیہ مزاحمت نہ کرے بلکہ مجبوراً اس کا ساتھ دے اور پھر اندر کھاتے اپنے مفادات کے تحفظ کا سوچے۔ اس کے بھی دو پہلو ہیں ایک تو یہ کہ ملک کی دینی قوتیں اس کی مخالفت کریں گی۔ دوسرے یہ کہ پھر سی پیک کا کیا بنے گا اور کیا چین اس پر خاموش رہے گا؟ **دوسرے:** یہ کہ چین اور روس اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے پاکستان اور ایران کا کھل کر ساتھ دیں بلکہ پاکستان، ایران اور ترکی مل کر ایک گروپ بنالیں اور امریکہ کی مزاحمت کریں۔ اس سے ممکن ہے امریکہ پاکستان اور ایران پر قبضہ نہ کر سکے (جیسا کہ شام میں امریکہ کامیاب نہیں ہوسکا) اگرچہ یہ ملک تباہی سے دوچار ہوں گے لیکن اس کا نتیجہ بہرحال یہ نکلے گا کہ امریکہ جس نے اگلے پچاس سال بعد ٹوٹنا تھا اگلے پانچ سال میں ٹوٹ جائے گا اور چین عالمی طاقت نمبر ا بن جائے گا۔سوال یہ ہے کہ پاکستان اور مسلمانوں کو اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ کیا چین عالمی طاقت نمبر ا بن کر استعماری انداز اختیار نہیں کرے گا؟ اس سے عالم اسلام کو کیا فائدہ ہوگا؟ اور اسلامی پاکستان کا متوقع نقشہ کیا ہوگا؟

یہ وہ معاملات ہیں جن پر سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ ہم حکومت پاکستان سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے خاموشی سے نہ کرے بلکہ معاملہ پارلیمنٹ میں لائے تا کہ اس پر کھلے عام بحث ہو اور جو فیصلہ ہو اس پر قوم کو اعتماد میں لیا جائے بلکہ قوم کا اتفاق رائے پہلے سامنے آئے اور فیصلے صرف اس کے مطابق ہوں۔

اسلام اور مغرب/ڈائیلاگ

محمد رشید[1]

'روحِ عصر' اور اسلام

جمہوریت 'روحِ عصر' ہے اور یہ خلاف اسلام نہیں ہے

[برادر محمد رشید صاحب کے مضمون کے بعد اس موضوع پر مدیر البرہان کا موقف ملاحظہ فرمائیں]۔

روح عصر کا آسان ترین مفہوم ہے" رواج زمانہ کا خلاصہ یا نچوڑ" ۔اب ہر زمانے کے مزاج میں اچھی عادتیں بھی ہوسکتی ہیں اور بری بھی، پسندیدہ افعال بھی ہوسکتے ہیں اور ناپسندیدہ بھی،خوبصورت خیالات وعزائم بھی ہوسکتے ہیں اور بدصورت بھی، جائز عوامل وعناصر بھی ہوسکتے ہیں اور ناجائز بھی۔ انبیاء کرام علیہم السلام جس قوم کی طرف بھیجے جاتے ہیں وہ اس قوم کی اچھی عادتوں، اچھے افعال اور اچھے وجائز خیالات وعزائم کو بدلنے نہیں بلکہ برے افعال، ناپسندیدہ عادتوں اور بدصورت خیالات کو تبدیل کرنے کے لیے مبعوث کیے جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر اگر ہم یہ کہیں کہ انبیاء کرام زمانے کا مزاج بدلنے کے لیے تشریف لاتے ہیں تو اس کا یہ مفہوم نہیں ہوگا کہ وہ انسانوں کے مزاج میں پہلے سے ہی پائی جانے والی اچھائی، خیر اور خوبصورتی کو بدلنے کے لیے آتے ہیں بلکہ اس کے برعکس وہ ثانی الذکر صورت میں انسانوں کا مزاج بدلنے آتے ہیں۔قرآن حکیم کی آیات اس بات پر گواہ ہیں کہ انبیاء کرام علیہم السلام بالعموم اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بالخصوص نوع انسانی کے :مزاج" میں پہلے سے موجود اچھائی اور خیر کو بدلنے کی بجائے اس کی حفاظت ونگہبانی کرتے ہیں۔اس تناظر میں کسی بھی زمانے کی زندگی کے کسی بھی شعبہ کی" روح عصر" اگر" روح اسلام" کے مخالف ہوگی تو اس مٹا دیا جائے گا، اگر زندگی کے کسی بھی شعبہ کی" روح عصر" یا اس کا کوئی قالب" روح اسلام" سے ہم آہنگ ہوگا یا اگر مباح بھی ہوگا تو اسے روح اسلام کے ماتحت کرتے ہوئے برقرار رکھا جائے گا۔

تاریخ کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ قدیم دور میں سیاسی زندگی کی" روح عصر" (یعنی اجتماعی

[1] ملتان، abu_munzir1999@yahoo.com

نظم، امن، عدالت اور دفاع وغیرہ) کو بروئے کار لانے کا واحد ڈھانچہ "بادشاہت یا ملوکیت" پر مبنی نظام حکومت تھا۔ ساتویں صدی عیسوی میں اسلام نے اس میں کانٹ چھانٹ کر کے اس کے عنوان کے لیے خلافت کا لفظ استعمال کیا اور بالعموم اسی کے ظاہری ڈھانچوں کو نظام خلافت کے لیے استعمال کیا تاہم اس کا خلاصہ اور نچوڑ شورائیت کو قرار دیا یعنی ریاست وسیاست کے امور مسلمانوں کے باہمی مشورے سے چلائے جائیں اور حکمران کے انتخاب اور اس کی معزولی میں اسلام کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں لوگوں کی اجتماعی رائے کو مرکزی اور فیصلہ کن حیثیت حاصل ہوتا ہم یہ نظام اپنی اعلیٰ ترین مثالی صورت میں تیس سے پچاس سال تک بروئے کار رہا۔ اس کے بعد "موروثی ملوکیت" کے تصور نے دوبارہ رواج حاصل کر لیا اور یہ نظام مسلمانوں میں کم وبیش ۱۲ صدیوں تک رائج رہا۔ بیسویں صدی میں تاریخ میں پہلی بار مغرب میں ہونے والے حادثات اور تجربات کے نتیجے میں "جمہوریت" (ڈیماکریسی) نامی نظام حکومت رواج پذیر ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ پوری دنیا کا مقبول ترین نظام حکومت بن گیا۔ حتیٰ کہ آج اس نظام کو اس حد تک مقبولیت اور رواج حاصل ہو چکا ہے کہ عملی طور پر اس کے سوا کسی اور نظام کا کوئی تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ ہم اپنے ایک سابقہ مضمون میں عرض کر چکے ہیں کہ قدیم دور کے "بادشاہت" کے نظام کی طرح "جمہوریت" میں بھی درجنوں خامیاں اور نقص موجود ہیں، لیکن جس طرح اولین دور کے مسلمانوں نے اپنے دور کے مروجہ نظام سیاست "بادشاہت" ہی میں کانٹ چھانٹ کر کے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا بالکل اسی طرز پر جدید دور میں بھی "جمہوری" طرز حکومت ہی میں کانٹ چھانٹ کر کے اسے اسلام کے مقصد کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ ہم اس مقام پر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جس طرح بادشاہت اپنے غالی اور انتہا پسندانہ مفہوم میں بدترین شرک اور ظلم واستبداد پر مبنی نظام حکومت رہا ہے بالکل اسی طرح جمہوریت اپنے غالی اور انتہا پسندانہ مفہوم میں بدترین ملحدانہ اور احمقانہ نظام حکومت ہے۔ ہمارے اسلاف نے "بادشاہت" کے غلو اور انتہا پسندی کو ختم کر کے اسے ظلم اور استبداد سے پاک کیا اور اسے نوع انسانی کی خدمت کے لیے استعمال کیا۔ لہٰذا ہمیں آج "جمہوریت" کے غلو اور انتہا پسندی کو ختم کر کے اسے الحاد وحماقت اور ظلم سے پاک کرنا ہے اور اسے نوع انسانی کی خدمت کے لیے استعمال کرنا ہے۔ قدیم دور میں بادشاہت ان معانی میں "روح عصر" تھی کہ نوع انسانی اپنی سیاسی زندگی کے مقصود اور نچوڑ

"امن، انصاف، دفاع اور کاروبار زندگی کی عادلانہ نگہبانی" کو بروئے کار لانے کے لیے ایک ہی نظام حکومت کو جانتی تھی اور وہ تھا "بادشاہت"۔ جبکہ جدید دور میں جمہوریت کو عین وہی حیثیت حاصل ہوچکی ہے جو قدیم دور میں بادشاہت کو حاصل تھی۔ اسی معانی میں جمہوریت جدید دور کی سیاسی زندگی کی روح عصر ہے۔ جمہوری نظام پوری دنیا میں جس وجہ سے مقبول ہوا وہ ہے اس کا یہ عنوان اور نعرہ کہ لوگوں کی حکومت لوگوں ہی کی اکثریتی رائے سے قائم ہونی چاہیے اور نظام حکومت کے فیصلے عوام کے مفاد میں ہونے چاہییں۔ جمہوری نظام سیاست کا یہ وہ خلاصہ ہے جو اسلام کے نظام خلافت اور شورائیت سے گہری مطابقت رکھتا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ جمہوری نظام کی یہ روح مغرب نے اسلام کی سیاسی تعلیمات اور اسلامی تہذیب ہی سے اخذ کی ہے تو اس حد تک یہ دعویٰ غلط قرار نہیں دیا جاسکتا۔

نبی اکرم ﷺ کی بعثت کے وقت مذہبی میدان میں عالم انسانیت کی "روح عصر" شرک تھی جبکہ سیاسی میدان میں "روح عصر" بادشاہت یا ملوکیت تھی۔ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب نے مذہبی میدان میں "روح عصر" کی سب سے بڑی برائی شرک اور اس کے ظاہری ڈھانچوں کو مٹانے میں اپنی تمام مساعی کو مرکوز کردیا جبکہ سیاسی میدان میں "روح عصر" (امن، انصاف ودفاع کے ظاہری ڈھانچے) ملوکیت کو بالکلیہ مٹانے کی بجائے اس کے صرف ان اجزا وعناصر کی کانٹ چھانٹ کی جو شرک، ظلم اور معصیت سے آلودہ تھے۔ جبکہ ملوکیت وبادشاہی کے باقی مباح ڈھانچے کو اپنی حالت پر رہنے دیا۔ بالفاظ دیگر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کی پیروی میں اولین دور کے مسلمانوں نے "ملوکیت یا بادشاہت" کی اسلام کاری کی، اسے بالکلیہ مٹانے کو اسلام کا مقصد نہیں سمجھا۔ یہی وجہ ہے کہ 12 سو سال تک عالم اسلام کا سیاسی ڈھانچہ اپنی تمام تر اسلامی خوبیوں اور شخصی خامیوں کے ساتھ "بادشاہت" ہی پر مبنی رہا۔

ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسلام کا پروگرام مذہب کے میدان میں شرک اور اس کے علمبردار مذاہب وتصورات کے بالکلیہ استیصال، انکار اور بیخ کنی پر مبنی ہے کیونکہ مذہب کا موضوع ہی تصور الہ اور بندگی الہ ہے۔ لیکن دیگر سیاسی، سماجی اور معاشی شعبہ ہائے حیات کا براہ راست موضوع چونکہ تصور الہ اور بندگی الہ نہیں بلکہ زندگی کے سیکولر (غیر مذہبی) شعبوں

میں ناگزیر انسانی ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔اس لیے ان شعبوں میں رائج الوقت ڈھانچوں اور استعمالات کو بالکلیہ مٹانے کی بجائے ،اسلام ان شعبوں کے جائزعوامل وعناصر کو باقی وقائم رکھتا ہے اور ان پر حاوی شرکیہ مذاہب کے اثرات ورواجات اورقوانین کومٹا کراپنے اثرات، رواج اورقوانین کوجاری ونافذ کرتا ہے۔

قدیم ادوار میں زندگی کے سیکولرشعبوں (سماجی،معاشی اور سیاسی) کی اسلام کاری یہ تھی کہ قدیم دور کے سماجی، معاشی اور سیاسی شعبہ ہائے حیات میں رائج مباح اور مثبت عوامل و عناصر کو باقی رہنے دیا گیااور مذموم وناجائزعوامل وعناصر کومٹا کران کی جگہ پر نئے عادلانہ عوامل و عناصر کورائج کردیا گیا۔عین اسی اصول پرجدید دور میں زندگی کے سیکولرشعبہ ہائے حیات کی اسلام کاری یہ ہے کہ سماجی، معاشی اور سیاسی شعبہ ہائے حیات میں رائج مباح اور مثبت عوامل وعناصر کو برقرار رکھا جائے اور مذموم وناجائزعوامل وعناصر کومٹا کر عادلانہ عوامل وعناصر کورائج کیا جائے۔

جس طرح قدیم دور کا غالب وفرمانروا شرک "بت پرستی" تھا بالکل اسی طرح جدید دور کا غالب وفرمانروا شرک "الحاد، مادہ پرستی اوروطنیت پرستی" ہے۔لہٰذا جس طرح قدیم دور میں اپنے وقت کے غالب وفرمانروا شرک "بت پرستی" کا بالکلیہ انکار کردیا گیا لیکن زندگی کے دیگرسیکولرشعبوں کے انکار کی بجائے ان کی اصلاح کی گئی اوران شعبوں میں رائج ونافذ مشرکانہ وظالمانہ قوانین ورواج کومٹا کر عادلانہ اصلاحات کی گئیں بالکل اسی طرح جدید دور کے سب سے بڑے شرک "الحاد، مادہ پرستی اور وطنیت پرستی" کا تو بالکلیہ انکار کردینا اورزندگی کے دیگر سیکولرشعبوں کے بالکلیہ انکار کی بجائے ان میں رائج مادہ پرستانہ وظالمانہ قوانین ورسوم کومٹا کر عادلانہ اصلاحات کرنا ہی اسلام کا عین مطلوب ہے۔

ہمارے بعض نہایت مخلص اہل علم کو یہ مغالطہ لاحق ہوگیا ہے کہ جدید دور کی ہر چیز اور ہر تصور وڈھانچے کا انکار کردینا ہی عین اسلام کا تقاضا ہے۔یہ اہل علم ہر اس مساعی، اس کاوش، اس فہم اور اس منہج کا بے رحمی سے مذاق اڑاتے ہیں اور اس کی تغلیط وتضلیل کرتے ہیں جس میں اسلام کی توحید وایمان اورعقائد وعبادات کی ہدایات کومرکز ومحور مان کر جدید زندگی کے سیکولرشعبوں کے مباح عوامل وعناصر کو باقی رکھنے کی بات کی جاتی ہے اور مادہ پرستانہ قوانین و رواج کومٹا کران کی جگہ پراسلام کے عادلانہ قوانین ورواج کو نافذ وجاری کرنے کی بات کی

جاتی ہے۔ان محترم اہل علم کے نزدیک زندگی کے جدید سیکولر(سیاسی،سماجی اور معاشی)شعبوں کے رائج الوقت ڈھانچوں کو مادیت پرستی اور الحاد سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا لہٰذا ضروری ہے کہ جدید مادہ پرستانہ وملحدانہ تہذیب سے منسلک سیاسی،سماجی اور معاشی غرض ہر ہر شعبہ ہائے حیات کو بالکلیہ منہدم کردیا جائے اس کا انکار کردیا جائے اور ازسرنو اسلام کی علمیات کی بنیاد پر زندگی کے سیاسی،معاشی اور سماجی شعبوں کی تعمیر کی جائے۔بادی النظر میں ان اہل علم کی یہ سوچ بڑی اچھوتی،وقیع اور دلکش محسوس ہوتی ہے۔لیکن ذرا گہرائی میں اتر کر اس سوچ کا تجزیہ کیا جائے تو یہ سوچ درحقیقت ایک بچگانہ اور" بدعتی سوچ" محسوس ہوتی ہے۔ یہ سوچ ایک خوبصورت اصطلاح" اسلام کی علمیات" کا بھی نہایت بے محل اور مکروہ استعمال کرتی ہے۔

ان اہل علم کے مذکورہ رویہ اور سوچ میں بالطبع اور خودکار طور پر یہ مہلک نتیجہ مضمر ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم،آپ کے اصحاب اور اولین دور کے مسلمانوں نے جس منہج اور طریق کار کو بروئے کار لاکر نوع انسانی کو جن دنیوی اور اخروی کامیابیوں سے سرفراز کیا،وہ (معاذ اللہ) ناقص طریقہ تھا۔کیونکہ اسلام کے اس اولین طریقے اور منہج میں زندگی کے سیکولر شعبوں کے انہدام پر نہیں بلکہ ان کی کانٹ چھانٹ اور اصلاح پر توجہات کو مرکوز کیا گیا۔اسلام شرک کے انکار وانہدام کی دعوت کے ساتھ زندگی کی معاشی،سماجی اور سیاسی سرگرمیوں کو تہس نہس کرنے اور زندگی کو معطل کرنے کی دعوت نہیں دیتا،بلکہ وہ زندگی کی ان ناگزیر سرگرمیوں کو جاری رکھ کر ان سے مشرکانہ وظالمانہ عوامل وعناصر کو نکال کر ان میں عادلانہ وموحدانہ رواجات جاری ونافذ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ہم نہایت ادب اور معذرت کے ساتھ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے اس مثبت،تعمیری اور فطری منہج سے منحرف وبدظن اہل علم کا یہ طبقہ اپنے موقف میں زور پیدا کرنے کے لیے ایسی ہر سوچ کو" اسلام کاری" کا نام دے کر اس کا خوب مذاق اڑاتا ہے جو زندگی کے سیکولر شعبوں کے مباح عناصر کو باقی رکھنے اور ملحدانہ و مادہ پرستانہ اصول وقوانین کو مٹا کر اسلامی اصول قوانین کو جاری ونافذ کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ان اہل علم کا یہ رویہ درحقیقت جدید مادہ پرستانہ وملحدانہ تہذیب سے سخت خوفزدہ،مرعوب اور شکست خوردہ ذہنیت کی غمازی کرتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام کے مثبت،تعمیری اور فطری منہج کی پیروی میں جدید دور کے غالب وفرمانروا نظریہ" الحاد و مادہ پرستی" کے انکار وانہدام کی دعوت دینے،نیز

جدید دور کے سیاسی، سماجی اور معاشی ڈھانچوں کے مباح عوامل وعناصر کو باقی رکھنے اور مادہ پرستانہ وملحدانہ عوامل وعناصر کی کانٹ چھانٹ کی بجائے یہ اہل علم بالکلیہ جدید دور کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی ہی کو مٹانے کے درپے ہوجاتے ہیں۔ان کے اس رویہ میں یہ خوف چھپا ہے جس کا وہ اظہار بھی گاہے بگاہے کرتے رہتے ہیں کہ اگر ان شعبوں کو بالکلیہ مٹا کر ان کی ازسرنو تعمیر نہ کی گئی تو ان شعبوں میں جاری وحاوی "الحاد اور مادہ پرستی" پورے اسلام کو نگل جائے گی۔تاہم اگر حقائق کا سیرت وسنت کی روشنی میں جائزہ لیا جائے تو یہ محض ان کا وہم، خوف اور فوبیا ہے۔لہٰذا جس طرح "اسلاموفوبیا" کی بیماری نے اچھے بھلے سوچنے سمجھنے والے مغرب کے اصحاب علم ودانش کی سوچ کے توازن اور اعتدال کو اچک لیا ہے۔جس کی وجہ سے وہ اسلام کی معمولی سے معمولی علامت اور اس کی واضح ونمایاں خوبیوں سے بھی نفرت اور خوف کی شدید کیفیات کا شکار رہتے ہیں بالکل اسی طرح "مغرب فوبیا" نے ہمارے اچھے بھلے سوچنے سمجھنے والے اصحاب علم ودانش کی سوچ کے توازن اور اعتدال کو اچک لیا ہے، جس کی وجہ سے وہ جدید دنیا کی معمولی سے معمولی علامت اور اس کی بعض واضح ونمایاں خوبیوں سے بھی نفرت اور خوف کی شدید کیفیات کا نہ صرف شکار رہتے ہیں بلکہ قرآن وسنت کے دلائل کو غلط استعمال کرتے ہوئے دیگر مسلمانوں کو بھی اس نفرت اور خوف میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ہم مکرر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح اسلام کے اولین دور میں اسلام کے پیروکاروں نے زندگی کے سیاسی میدان میں "روح عصر" (بادشاہت) کے ڈھانچے کے بالکلیہ انہدام وانکار کی بجائے اس کے مذموم اور ناجائز عوامل وعناصر کی کانٹ چھانٹ اور اصلاح کا کارنامہ سرانجام دے کر بادشاہت کے ڈھانچے کو اسلام کے مزاج وتقاضوں کے موافق وماتحت کردیا۔بالکل اسی طرح جدید دور میں اسلام کے پیروکار زندگی کے سیاسی میدان میں "روح عصر" کے ظاہری ڈھانچے (جمہوریت) کے بالکلیہ انہدام وانکار کی بجائے اس کے مذموم وناجائز عوامل وعناصر کی کانٹ چھانٹ اور اصلاح کا کارنامہ سرانجام دے کر جمہوریت کے ڈھانچے کو اسلام کے مزاج و تقاضوں کے موافق وماتحت کرسکتے ہیں۔اس تناظر میں یہ منہج اسلام کے اولین دور کے مسلمانوں کے منہج ہی کی پیروی ہے۔اس مفہوم میں "جمہوریت کی اسلامکاری" کوئی ایسا قبیح طرز عمل نہیں کہ جس پر طعن وطنز اور تضحیک واستہزا کے تیر برسائے جائیں۔

ہمیں سخت حیرت ہوئی کہ سطور بالا میں پیش کی گئی معروضات و بیانیہ کا علمی تجزیہ کرنے اوراس کی علمی کمزوری کی نشاندہی کرنے کی بجائے" روح عصر" کو گندگی ونجاست فرض کرتے ہوئے ایسا دعویٰ کیا گیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ" روح عصر" میں کانٹ چھانٹ اور اصلاح درحقیقت" گندگی ونجاست" میں کانٹ چھانٹ اوراصلاح کی دعوت ہے۔ ہماری رائے میں " روح عصر" کو کلی طور پر گندگی اور نجاست کے مساوی سمجھنا سخت غیرعلمی اورجذباتی رویہ ہے۔سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انبیاءکرام جیسے پاکیزہ اورمقدس ترین گروہ نے بھی اپنے اپنے زمانہ کےمزاج، عادات اورمباح اطوارکی رعایت کی اوراپنے ہی زمانہ کے سماجی، سیاسی اورمعاشی ڈھانچوں کے مباح عوامل وعناصرکو برتنے اورظلم، معصیت اورشرک پر مبنی عوامل و عناصرکو بدل دینے کی دعوت دی تو جدید دنیا کے کسی بھی عالم، دانشوراور مصلح کوکیاحق پہنچتا ہے کہ وہ انبیاءورسل، نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ وتابعین کے منہج سے ایک قدم آگے بڑھ کر یہ اعلان کرے کہ اسلام معاصر دنیا کے جاہلی معاشروں کی ہر ہر عادت، طورطریقے اورسماجی، سیاسی اورمعاشی ڈھانچوں کے ہر ہرعنصرحتیٰ کہ جائز ومباح اموروعنوانات کوبھی مٹانے اور انسانی زندگی کی ناگزیرضرورتوں کو پورا کرنے والے ہر ہرڈھانچے کومنہدم کرکے انہیں ازسرنو استوارکرنے آیا ہے۔ ہماری رائے میں یہ دعویٰ ایک بے برکت ، بےثمر، انتہا پسندانہ اور مبالغہ آمیز دعویٰ ہے۔ یہ دعویٰ بے سند، بےمعنی ،انبیائے ورسل کے منہج کے خلاف اورسنت و سیرت کا مخالف دعویٰ ہے۔اس دعویٰ کوسنت وسیرت سے کسی طورثابت نہیں کیا جاسکتا۔اس کے برعکس یہ دعویٰ اسی مغرب اورانہی مغربی انقلابی فلسفوں سے ماخوذ ہےجس کی نفی وانکاراور استیصال وانہدام ہی اس دعویٰ کے حاملین کا سب سے بڑانعرہ ہے۔

درج بالامعروضات کے ذریعے زیرتنقید نقطہ نظر کے حامل نہایت محترم صاحبان علم و دانش کی تنقیص اورتوہین مقصودنہیں ہے۔ بلکہ ان معروضات میں تحریر ہونے والےبعض سخت گیرجملوں کا مقصد درحقیقت زیربحث متنازعہ سوچ کوجھنجھوڑنا اوراس پر گرفت کرنا ہے۔ اگر ہمارے کسی لفظ یا جملے سے کسی قسم کی توہین یا تنقیص کا پہلو نکلتا ہےتو ہم اس پر دست بستہ معافی کےخواستگارہیں۔ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ زیرتنقید نقطہ نظرکے حامل اہل علم ودانش کی تکریم اور احترام کو ہم دینی اور اخلاقی ہردونقطہ نظر سےفرض سمجھتے ہیں۔ھٰذا ماعندی والعلم عنداللہ.

اسلام اور مغرب/ڈائیلاگ

ڈاکٹر محمد امین

مغربی جمہوریت کی 'روحِ عصر' غیر اسلامی اور ناقابل قبول ہے

برادرم محمد رشید کے نقطۂ نظر کے جواب میں

برادرم محمد رشید صاحب کا مضمون آپ نے سطور سابقہ میں ملاحظہ فرمایا۔ ہماری رائے میں ان کے ہاں صحیح اور غلط باتیں ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں جن کی وضاحت کے لیے ہم اپنا موقف اختصار کے ساتھ ان کے اور قارئین کے سامنے رکھتے ہیں۔ چونکہ یہاں مناظرہ مقصود نہیں بلکہ اختلاف فکر ونظر کو دلائل کے ساتھ سمجھنا ہے، لہٰذا اس موضوع پر محمد رشید صاحب اور راقم کا موقف سامنے آنے کے بعد ہم اس موضوع پر مزید مضامین شائع نہیں کریں گے۔

۱۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام ایک دین ہے جو اپنے پیروکاروں کو اللہ ورسول کی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا سکھاتا ہے۔ اسی طرح مغربی تہذیب بھی ایک 'دین' ہے جو خدا اور رسول کی رہنمائی کو رڈ کرتے ہوئے انسانی عقل اور تجربہ ومشاہدہ پر انحصار کرتے ہوئے زندگی گزارنا سکھاتا ہے۔ یہ دونوں مستقل اور انڈی پنڈنٹ پیراڈائم ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں اور انہیں اکٹھا نہیں کیا جا سکتا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ پیغمبر اس لیے معبوث فرماتا ہے کہ وہ زندگی گزارنے کے لیے اللہ کی ہدایت لوگوں تک پہنچادیں اور اس ہدایت کے مطابق زندگی گزار کر عملاً لوگوں کو دکھادیں۔ ان کی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ وہ اس دین (یعنی دین اسلام) کو دوسرے ادیان پر (جو کفر یعنی انکارِ دین اسلام پر مبنی ہوتے ہیں) پہلے دعوت واصلاح کے ذریعے اور ضرورت ہو تو جہاد (یعنی قوت) کے ذریعے ان پر غالب کردے۔ یہی رویہ کفر کا ہے کہ ابلیسی قوتیں اسے ''دینِ حق'' پر غالب کرنے کی پوری کوشش کرتی ہیں۔ اسلام اور کفر کے درمیان یہ کشمکش ازل سے چلی آرہی ہے اور ابد تک جاری رہے گی کیونکہ قرآن حکیم کے مطابق ابلیس نے جب اللہ کے حکم کی نافرمانی کی اور راندۂ درگاہ ٹھہرا تو اس نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی کہ اسے لوگوں کو بھٹکانے کا موقع دیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے اسے اس کی اجازت دے دی۔ بقول اقبال ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بو لہبی!

اور''دین اسلام'' اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً کا تقاضا کرتا ہےاورانسانوں سےساری زندگی میں بلاشروط وحدودمکمل عبودیت وبندگی (یعنی پرستش واطاعت) کا مطالبہ کرتا ہےاور اس میں دینی ودنیاوی اور مذہبی وغیر مذہبی (انگریزی میں Secular & Spiritual) میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ ایک مسلمان اسلام کی رو سے اس چیز کا مکلف ہے کہ وہ اپنی ساری زندگی، الف سے لے کری تک، چھوٹی بات سے لے کرامہات امور تک، سب میں اللہ کی اطاعت کرے اورغیر اللہ (طاغوت) کی اطاعت نہ کرے....تاہم اس کے باوجودمعاملات میں پیغمبر کسی حدتک لچک کا مظاہرہ کرتے ہیں اوراس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر کی مخاطب امت میں پہلے سے کچھ ایسے معروفات مروج ہوسکتے ہیں جو اسلام کی روح اور مقاصد کے خلاف نہ ہوں۔اس کے دوسبب ہوسکتے ہیں: ایک تو یہ کہ وہ پہلے انبیاء کی تعلیمات کا بچا کھچا جزو ہوں جو تاریخ میں سفر کرتے ہوئے ان تک پہنچے ہوں یا وہ عقل وحکمت پر مبنی ہوں۔اور اسلام عقل وحکمت کوکلیتاً ردّ نہیں کرتا بلکہ انہیں وحی کے تابع رکھتا ہےیعنی وہ وحی کے مقابلے میں انسانی عقل ودانش کومعیار، میزان اورفرقان تونہیں مانتاالبتہ اگران کی کوئی روش خلاف اسلام نہ ہوتو انہیں ردّ بھی نہیں کرتا۔

یہ بھی واضح رہے کہ پیغمبر معاملات میں سابقہ معروفات کا جولحاظ کرتا ہےتو یہ پروسیس پیغمبر کی وفات کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ جب پیغمبر یہ کام کررہا ہوتا ہےتو اسے وحی کی صیانت حاصل ہوتی ہے جواس کی کسی ممکنہ غلطی کی تصحیح کرسکتی ہےلیکن پیغمبر کی وفات کے ساتھ ہی جب وحی کا سلسلہ بند ہوجاتا ہےتو یہ پروسیس بھی ختم ہوجاتا ہے، دین مکمل ہوجاتا ہےاور امت اس پروسیس کوجاری نہیں رکھ سکتی۔آنے والی نسلوں میں یہ عمل کیسے جاری رہتا ہےاس کی صورت اجتہاد کی ہےجس کے بارے میں تفصیل آگےآرہی ہے۔

۳۔ مغرب کی ملحدانہ فکروتہذیب کے بارے میں مسلم ردّعمل کی چارشکلیں ہوسکتی ہیں:

i۔ مغربی فکروتہذیب خلاف اسلام ہے لہٰذا یہ قابل ردّ ہےاور اس سے کسی نوع کا استفادہ جائزنہیں۔ہماری رائے میں یہ موقف انتہاپسندی پرمبنی ہے۔

ii۔ مغربی فکروتہذیب کو قبول کرلیا جائے اور اسلام کی ایسی تعبیر کی جائے جو مغربی فکروتہذیب کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ یہ موقف مسلم اہلِ علم میں سے متجددین کا ہے جو ہماری رائے میں غلط اور ناقابل قبول ہے۔

iii۔ کچھ لوگوں کی رائے تلفیق کی ہے کہ کچھ باتیں اسلام کی اور کچھ باتیں مغربی تہذیب کی لے لی جائیں اور اس ملغوبے پر عمل کیا جائے۔ ہماری رائے میں یہ موقف بھی غلط ہے کیونکہ دو متضاد عناصر/نظریات/ ادیان/ پیراڈائمز کو یکجا کرکے کوئی تیسرا مفید، تعمیری، بامقصد اور قابلِ عمل مرکب تیار نہیں کیا جاسکتا۔

iv۔ مغربی تہذیب کا اصولی رد اور اس سے محدود و محتاط استفادہ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام اور مغربی فکروتہذیب بلاشبہ ایک دوسرے سے متضاد ہیں لیکن اس کے باوجود معاملات میں مغرب سے محدود، مشروط اور محتاط استفادے کی کچھ گنجائش موجود ہے جس کی تفصیل یہ ہے:

اللہ تعالیٰ نے زندگی گزارنے کے لیے جس ہدایت سے ہمیں نوازا ہے، اس کے چار بڑے شعبے ہیں: عقائد، عبادات، اخلاق اور معاملات۔ پہلے تین شعبوں میں چونکہ تغیر مطلوب نہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے وہاں جامد اور ناقابل تغیر احکام عطا فرمائے۔ لیکن چوتھے شعبے میں چونکہ تغیر کا سامنا تھا اس لیے وہاں شارعِ حکیم نے اصولی باتیں اور پالیسی امور طے کردیے لیکن تفصیلات امت (اور اس کے اہل علم یعنی مجتہدین) پر چھوڑ دیں تاکہ وہ اپنے حالات اور ضرورتوں کے مطابق ان کا تعین کرلیں۔ معاملات کا یہ نصف ثانی وہ ہے جسے امت اجتہاد کے ذریعے پورا کرتی ہے۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ اسلام نے ہمیں سیاسی اصول تو دیے ہیں تفصیلی سیاسی نظام نہیں دیا بلکہ یہ ہر عہد کے مجتہدین کا کام ہے کہ وہ ان تفصیلات کا تعین کریں اور مکمل سیاسی نظام وضع کریں۔ اسی بات کو معاشی نظام، تعلیمی نظام، عدالتی نظام وغیرہ پر قیاس کرنا چاہیے۔

اب یہ جو معاملات کا نصف ثانی ہے اس میں مسلم اہل علم اپنی ضروریات، حالات اور معاصر مشکلات کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو عالم معاصر حالات کی سمجھ نہیں رکھتا وہ اجتہاد کا اہل ہی نہیں ہوتا کیونکہ اصول یہی ہے کہ "ý Kø j Ÿ ;'Ĉ i1ýLanâbm ΣLĂ ¶ اب مباحات کے اس اجتہادی دائرے میں ہم دوسری قوموں کے تجربات سے فائدہ اٹھاسکتے ہیں اور ضرور اٹھانا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ کوئی تہذیب بھی ہوا بند خانوں (Air Tight

Compartments) میں پروان نہیں چڑھتی بلکہ اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے اور اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے دوسری تہذیبوں اور قوموں سے محدود استفادہ کرتی ہے۔

لیکن یہاں بھی یہ بات مدنظر رکھنی ضروری ہے کہ ہر دین/ تہذیب/ پیراڈائم کے ادارے اس کے اساسی نظریات، ورلڈ ویو اور فلسفۂ علم کی پیداوار ہوتے ہیں اور انہیں بعینہٖ اٹھا کر کسی دوسری تہذیب کے اداروں سے پیوند نہیں کیا جاسکتا۔ صرف ایسی چیزیں ہی لی جاسکتی ہیں جو غیر اقداری (Value-Neutral) ہوں، جو بہت کم ہوتی ہیں۔ تاہم اگر ان میں سے کسی چیز کا لینا ناگزیز ہوتو ضروری ہے کہ اسے لے کر اپنے حالات کے مطابق تبدیل جائے اور پھر ہی انہیں استعمال کیا جائے۔

ہم اس کی ایک مثال سے وضاحت کرنا چاہیں گے۔ مغرب کی جمہوریت مغربی تہذیب کے بنیادی نظریات یعنی ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم اور ایمپیریسزم پر اور ان سے کشید کردہ کافرانہ ورلڈ ویو پر مبنی ہے لہٰذا وہ کفر والحاد کی پوٹ ہے کیونکہ ہیومنزم کا مطلب یہ ہے کہ انسان خدا کا بندہ نہیں بلکہ خود مختار ہستی ہے۔ سیکولرزم یہ ہے کہ یہ فیصلہ انسان کرے گا کہ اللہ کی بات کہاں ماننی ہے اور کہاں نہیں ماننی اور یہ کہ خدا کو انسانوں کے اجتماعی معاملات (جیسے سیاسی اور معاشی معاملات) میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ لبرل ازم کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی مرضی کرنے میں آزاد ہے اور کسی خدا ورسول کا پابند نہیں۔ کیپٹل ازم کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے اور آخرت کس نے دیکھی ہے لہٰذا دنیا میں دولت، ترقی، کامیابی اور اس میں لذتوں، سہولتوں اور آسائشوں کا حصول ہی انسان کا مقصد حیات ہونا چاہیے اور ایمپیریسزم کا مطلب یہ ہے کہ وحی کوئی چیز نہیں، علم کا منبع انسانی عقل اور اس کا تجربہ ومشاہدہ اور سائنس ہے۔

اب ظاہر ہے ان نظریات اور ان پر مبنی مغرب کے کافرانہ ورلڈ ویو کی پیداوار مغربی جمہوریت کو اسلام کا سیاسی مزاج ہرگز قبول نہیں کرسکتا.... لیکن اسلام کا سیاسی اصول یہ ہے کہ حکمران کا انتخاب مسلمانوں کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیے۔ اب پاکستان جیسے ملک میں جہاں ۲۲ کروڑ لوگ رہتے ہیں اور وہ ہزاروں میلوں میں پھیلے ہوئے ہیں، وہاں لوگوں کی رائے کیسے لی جائے؟ اب لوگوں کی رائے دریافت کرنے کا یہ عمل ایک انتظامی معاملہ ہے اور اس کے لیے اگر مغرب نے کوئی تجربہ کر رکھا ہو اور اس میں کوئی چیز غیر اسلامی نہ ہوتو ہم اسے

استعمال کر سکتے ہیں۔ اور اگر اس میں کوئی چیز غیر اسلامی ہو تو اسے خارج کر کے اور اپنی ضروریات کے مطابق تبدیل کر کے ہم اسے استعمال کر سکتے ہیں۔

ہماری اس روش کو تجدد سے تشبیہ نہیں دے جا سکتی کیونکہ تجدد تو اسلامی تعلیمات کی ایسی تعبیر کرنا چاہتا ہے جو مغربی تہذیب کے مطابق ہو، اس مغربی تہذیب کے مطابق ہو جو سرتاپا اقداری (Value Loaded) ہے اور خلافِ اسلام ہے۔

۵۔ سطور بالا کی بحث سے واضح ہے کہ مغرب کی سیکولر، لبرل اور سرمایہ دارانہ جمہوریت کفر و الحاد پر مبنی ہے اور اس کے غیر اسلامی ہونے میں کوئی شک نہیں اور اسے ہم 'روحِ عصر' کہہ کر قبول نہیں کر سکتے۔ معاف کیجیے گا ہمیں مغرب سے سیاسی نظام نہیں لینا، ہم مغربی تہذیب سے مختلف اور متضاد دین اور پیراڈائم ہیں لہٰذا ہمیں اپنا الگ سیاسی نظام قائم کرنا ہے۔ ہمیں اپنا الگ معاشی نظام، تعلیمی نظام، عدالتی نظام.... قائم کرنا ہے۔ ہم صرف وہ معروفات قبول کر سکتے ہیں جو اسلامی تعلیمات اور مقاصد کے مطابق ہوں، وہ معروفات قبول نہیں کر سکتے جو اسلامی تعلیمات اور مقاصد کے خلاف ہوں۔ اسلام کے نظام حیات کے مطابق انسان اللہ کا عبد ہے جب کہ مغربی فکر و تہذیب کے مطابق انسان اپنا خدا خود ہے اور وہ کسی خدا کا عبد نہیں ہے۔ اسلام اور مغرب کی سیاسی فکر میں زمین و آسمان کے درمیان فاصلے جتنے اس فرق کو ہم کیسے پاٹ سکتے ہیں؟

تاہم جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا، معاملات میں مباحات اور اجتہاد کا ایک دائرہ ایسا ہے جس میں ہم معاصر مغربی دانش سے محدود، مشروط اور محتاط استفادہ کر سکتے ہیں اور وہ ضرور کرنا چاہیے بشرطیکہ ہم یہ اپنے اصولوں پر قائم رہتے ہوئے کریں، اپنے نظام حیات اور اپنے سیاسی نظام پر قائم رہتے ہوئے کریں۔ یہ احتیاط اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم حال ہی میں مغرب کی دوصد سالہ غلامی کے چنگل سے نکلے ہیں، بلکہ شاید ابھی تک پوری طرح نکل بھی نہیں سکے اور اس کی فکری اور عملی غلامی کے مہیب اثرات ابھی تک ہم پر موجود ہیں لہٰذا کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم معاملات اور مباحات کے دائرے میں بھی مغرب کی فکری اور عملی غلامی کی طرف لڑھک جائیں کہ بقول اقبال ؎

تھا جو نا خوب، بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اسلام اور مغرب

محمد صفدر بشیر

دہشت گرد کون ۔ مغرب یا مسلمان؟

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ دنیا میں ایسے مذاہب ومسالک ابھرتے رہے ہیں جنہوں نے ظلم وستم اور تشدد کی راہ اپنائے بغیر اپنے متعقدین اور پیروکاروں کا وسیع حلقہ اثر پیدا کیا۔لہٰذا یہ تاثر بالکل بے بنیاد ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے یا آج کا مسلمان تشدد ودہشت گردی کے ذریعے اسلام جیسا پُرامن مذہب پھیلانا چاہتا ہے۔

ایک جرمن نژاد مسلمان اسکالر سے جب دہشت گردی اور اسلام کے حوالے سے سوال پوچھا گیا تو اس نے تاریخی حقائق پر مبنی درج ذیل جواب دیا۔ یہ حقائق ناقابل تردید ہیں جن کا جاننا ہم سب کے لیے بے حد ضروری ہے۔

- اس نے سوال کرنے والے سے پوچھا: دنیا کی پہلی جنگ عظیم کس نے شروع کی تھی؟ مسلمانوں نے تو نہیں کی تھی۔

- دنیا کی دوسری جنگ عظیم کس نے شروع کی تھی؟ یقیناً یہ بھی مسلمانوں نے شروع نہیں کی تھی۔

- کس نے چھ ملین یہودیوں کو ہولوکاسٹ میں (اجتماعی طور پر آگ میں جلا کر) قتل کیا تھا؟ یہ جرم بھی مسلمانوں نے نہیں کیا تھا۔

- آسٹریلیا میں کس نے تقریباً بیس ملین اصلی قدیم باشندوں کو تہہ وتیغ کیا تھا؟ مسلمانوں نے یہ جرم بھی نہیں کیا تھا۔

- ہیروشیما اور ناگاساکی پر نیوکلیئر بم کس نے برسائے تھے جس نے نسلوں کی نسلیں اور فصلیں تباہ وبرباد کر کے رکھ دی تھیں؟ یہ جرم عظیم بھی مسلمانوں کے ہاتھوں نہیں ہوا تھا۔

- شمالی امریکہ میں سو ملین سے زائد انڈنیز کو موت کے گھاٹ اُتارنے والے کون تھے؟ مسلمانوں نے تو یہ جرم نہیں کیا تھا۔(بقیہ صفحہ نمبر:۲۸)

شذرات　　　　مدیر

شذرات/مختصر تبصرے

جدید نظام تعلیم کی اصلاح کی زیادہ ضرورت ہے

دینی مدارس مغرب کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں کیونکہ وہ انہیں پاکستانی معاشرے میں اپنے فکری، تہذیبی، سیاسی، ثقافتی.... غلبے کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے اور انہیں نابود کرنا چاہتا ہے۔

ہمیں تسلیم ہے کہ دینی مدارس کے نظام تعلیم میں اصلاح کی گنجائش بھی ہے اور ضرورت بھی۔ لیکن اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ مدارس کو کہا جائے کہ وہ اپنی اصلاح خود کریں یا حکومت ان سے مل کر ان کی مشاورت اور رضامندی سے اصلاحی اقدامات کرے۔

لیکن ہم کہتے ہیں کہ اس سے زیادہ اصلاح کی ضرورت جدید نظام تعلیم کو ہے۔ یہ فرسودہ نظام تعلیم لارڈ میکالے کی میراث ہے۔ اسے اسلامی مقاصد کے لیے اسلامی خطوط پر استوار کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش آج تک ہوئی ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ مغرب زدہ ہے اور دینی علوم اور دینی تربیت دونوں سے محروم ہے۔ یوں وہ اچھے مسلمان اور اچھے انسان پیدا کرنے کی بجائے مغرب کی فکری غلام اور بے کردار نسل کی پرورش کررہا ہے۔ ہم حکومت سے پوچھتے ہیں کہ اس کے پاس جدید نظام تعلیم کی اصلاح کا ایجنڈا کیا ہے اور اس کے لیے اس کی پلاننگ کیا ہے؟

سری لنکا میں مسلم دہشت گردی

سری لنکا میں ایسٹر کے عیسائی تہوار کے موقع پر ایک مسلمان گروپ نے چرچوں پر حملے کرکے اپنی مسلح کارروائیوں سے پورے ملک کو دہشت زدہ اور مفلوج کردیا اور سیکڑوں جانوں کے ضیاع کا سبب بنا۔ حالانکہ سری لنکا حکومت کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ کبھی جارحانہ نہیں رہا۔ اب البتہ اس کے ردّعمل میں عام مسلمان حکومتی حلقوں اور عامۃ الناس کے معتوب ٹھہرے ہیں۔ بظاہر یہ حملہ نیوزی لینڈ کی مسلم کش کارروائی کا ردّعمل تھا۔ جب نیوزی لینڈ میں مسلمانوں پر حملہ ہوا تھا تو ہم نے اس وقت مسلمانوں سے استدعا کی تھی کہ وہ مظلومیت کی اس فضا سے فائدہ اٹھائیں اور دعوتِ دین کا کام کریں اور کسی طفلانہ اور احمقانہ ردّعمل کا شکار ہوکر جوابی وار نہ کریں۔ ہم خوش تھے کہ اکا دُکا انفرادی واقعات کے علاوہ اس کا شدید ردّعمل سامنے نہیں آیا

لیکن سری لنکا میں ایک انتہا پسند مسلمان مذہبی گروپ نے بے گناہ شہریوں پر حملے کر کے بزدلانہ اور احمقانہ انتقامی کاروائی کی جس کا سری لنکا کے مسلمانوں کو بھی نقصان ہوا اور عالمی سطح پر بھی مسلمانوں کا امیج بگڑا۔ ہم اس ردّعمل کی مذمت کرتے ہیں اور اسے ہرگز عاقلانہ اور دور اندیشی کی کاروائی نہیں سمجھتے بلکہ یہ اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔

عمران حکومت معاشی بحران سے نمٹنے میں کیوں ناکام ہے؟

اس کی ایک وجہ تو عمران حکومت کے فنانشل منیجرز کی نالائقی ہے گو اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انہیں برے معاشی حالات ورثے میں ملے تھے۔ دوسری وجہ ابھی مخفی ہے۔ بات یہ ہے کہ امریکہ جس طرح کے نتائج طالبانِ افغانستان کے ساتھ مذاکرات سے حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ اسے حاصل نہیں ہو رہے۔ پاکستان پر در پردہ الزام یہ ہے کہ وہ بادشاہ سلامت کی خواہش پوری کرنے میں مدد کیوں نہیں کر رہا؟ پاکستان کی عسکری اور سیاسی قیادت کا جواب یہ ہے کہ وہ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کیونکہ جو طالبان جانوں کی قربانیاں دے کر برسوں سے ارض افغانستان کو اپنے خون سے گل وگلزار کر رہے ہیں وہ امریکی خواہش کے آگے نہیں جھک سکتے۔ اسی وجہ سے گوادر کے قریب سمندر سے تیل کی رپورٹ بھی منفی آئی ہے اور آئی ایم ایف نے بھی ڈٹ کر اپنی شرطیں منوائی ہیں اور اس کے باوجود ملک کی معیشت نہیں سنبھل رہی اور ڈالر کی اڑان قابو میں نہیں آ رہی۔ غیر جانبدار حلقوں کے مطابق بلوچستان میں تیل اور گیس کے وسیع ذخائر موجود ہیں لیکن علاقائی اور بین الاقوامی طاقتیں نہیں چاہتیں کہ پاکستان پھلے پھولے اور خوشحال ہو بلکہ ان کی پوری کوشش ہے کہ پاکستان پٹ جائے اور اس کی نیوکلر حیثیت ختم کر دی جائے۔ بحر ہند میں امریکی بحری بیڑے بڑے کی آمد بھی اسی سلسلے کی کڑی محسوس ہوتی ہے کیونکہ پہلے بھی حملہ افغانستان پر ہوا تھا جبکہ ہدف پاکستان تھا۔ اللہ تعالیٰ ہماری عسکری اور سیاسی قیادت کو جرأت اور فراست عطا فرمائے تا کہ ملک اغیار کی سازشوں سے بچ کر موجودہ بحران سے نکل سکے۔

عمران حکومت کی ایک نالائقی یہ بھی ہے کہ اس نے سارا معاشی بوجھ غریب عوام تک منتقل کر دیا ہے اور مہنگائی نے ان کا جینا دوبھر کر دیا ہے۔ حکومت کو چاہیے تھا کہ ہر متبادل حل آزماتی لیکن عوام پر مہنگائی کا بوجھ نہ ڈالتی۔ اگر یہ صورتِ حال جاری رہتی ہے تو عوام کا حکومتی پالیسیوں کے خلاف ہو جانا فطری ہوگا۔

فواد چوہدری کی سائنس اور رویت ہلال

فواد چوہدری ایک سیکولر اور جاہل آدمی ہے۔ وہ اسلام اور علماء کو استہزاء کا نشانہ بنانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ وہ عمران خان کی حکومت کا سیکولر چہرا ہے اور عمران خان کے لیے قابل قبول ہے ورنہ وہ عمران خان کی ایک گُھرکی کی مار ہے۔ بہر حال یہ لوگ علماء کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مفتی منیب صاحب اور مفتی پوپلزئی صاحب دونوں کا نقطۂ نظر غلط ہے۔ مفتی پوپلزئی صاحب کا یہ موقف کہ عید حرمین کے ساتھ کی جائے، ایک مخدوش موقف ہے۔ اسی طرح مفتی منیب الرحمن صاحب کی یہ رائے کہ چاند دیکھنے میں ریاضی کے حساب کتاب اور سائنسی آلات سے مدد لی جائے، بھی ایک کمزور موقف ہے کیونکہ شارع علیہ السلام نے دین کو سادہ، آفاقی اور ایک عام مسلمان کی پہنچ میں رکھنے کے لیے چاند کے مشاہدۂ عام کا حکم دیا تھا۔ رویت ہلال بھی مشاہدۂ عمومی کا معاملہ ہے۔ مفتی منیب صاحب اور پوپلزئی صاحب اسے خواہ مخواہ پیچیدہ بنا رہے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ ایک ''قومی ریاست'' کی اور اس میں اتحاد کے مظاہرے کے لیے ایک ہی روز عید کرنے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ یہ ''قومی ریاستیں'' تو مغرب نے جبراً کھڑی کی ہیں تا کہ مسلم امت منتشر رہے، اس میں اتحاد نہ ہو اور وہ طاقت ورنہ ہو تو ہمیں ان ۵۷ چھوٹی قومی ریاستوں کو تحفظ دینا چاہیے یا انہیں ختم اور ضم کر کے انہیں متحد کرنے کا سوچنا چاہیے؟ علماء کرام کو چاہیے کہ شریعت کے احکام کی سپرٹ کو علی حالہ قائم رہنے دیں اور عالم اسلام اور اس کے دین میں مغرب کی مداخلت کو رد کر دیں نہ کہ اسے Legitimize کرنے کے مختلف حیلے ڈھونڈیں۔

سعودی عرب میں علماء پر ظلم وستم

الجزیرہ، القدس ڈاٹ کام، مڈل ایسٹ آئی وغیرہ نے اطلاع دی ہے کہ سعودی حکومت جیلوں میں محبوس ان سیکڑوں علماء کرام میں سے جو حکومت کی موجودہ سیکولر اور مغرب پرست پالیسیوں سے اختلاف کر رہے ہیں ان کے نمایاں افراد کو رمضان کے بعد پھانسی دینے کا پروگرام بنا رہی ہے جن میں فضیلۃ الشیخ سلمان العودۃ، الشیخ عوض القرنی اور الشیخ علی العمری شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ سعودی حکمرانوں کو ہدایت نصیب فرمائے اور علماء کرام کو حکومت کے ظلم وستم سے بچائے۔

استفسارات

سلیم طارق لون[۱]

فہمِ قرآن سے متعلق چند سوالات

محترم ڈاکٹر صاحب!

قرآن حکیم کا مطالعہ کرتے ہوئے بعض سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں جن کا جواب میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر آپ یا کوئی دوسرا صاحب علم میری رہنمائی کر سکے تو شکر گزار رہوں گا:

۱۔ قرآن حکیم میں ’قلب اور قلوب‘ کے الفاظ بہت مقامات پر آئے ہیں (قلب ۵۳ مرتبہ اور قلوب ۱۰۴ مرتبہ) کیا قلب سے مراد انسانی دل ہے جو ہمیشہ دھڑکتا رہتا ہے اور تمام جسم میں خون پہنچاتا ہے۔ اور وہ خوشی، غم اور خوف کی کیفیات سے متاثر بھی ہوتا ہے جس سے اس کی دھڑکن تیز اور آہستہ بھی ہوجاتی ہے۔ یہ کیفیات دل کو ہمارے اعصابی نظام کے ذریعے متاثر کرتی ہیں جو ہمارے دماغ سے شروع ہو کر تمام جسم میں پھیلا ہوا ہے۔

* قرآن حکیم میں آتا ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں مگر دل اندھے ہوتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔

* دلوں پر غلاف چڑھنا اور دلوں کا سخت ہوجانا بھی قرآن حکیم میں مذکور ہے۔

* پھر قرآن حکیم میں عقل کا بھی ذکر ہے۔ (تقریباً ۴۹ مقامات پہ مختلف انداز میں)

* آج کے دور میں میڈیکل سائنس کی روشنی میں دل اور دماغ کے بارے میں بہت سی معلومات موجود ہیں۔

* دل کا کام شریانوں کے ذریعے خون کو جسم کے تمام حصوں میں پہنچانا ہے۔

اور دماغ کا کام سوچنا اور اعصابی نظام کو چلانا۔ اس کے علاوہ دماغ کا ایک حصہ حافظہ کا کام کرتا ہے۔

[۱] سابق آئی جی پولیس، اسلام آباد، saleem.lone@gmail.com

۲۔ کیا نفس کا تعلق دماغ سے ہے؟ قرآن حکیم میں نفس امارہ، نفس لوّامہ اور نفس مطمئنّہ کا ذکر آتا ہے۔

❁ روح، نفس، قلب اور دماغ کا باہمی تعلق قرآن حکیم کی روشنی میں کیا ہے؟

۳۔ قرآن حکیم میں سات آسمانوں اور سات زمینوں کا تذکرہ موجود ہے۔ سات آسمان تو عرش تک پھیلے ہوئے ہیں اور جنت بھی عرش کے ساتھ ہے۔ اُس کی چھت پہ عرش قائم ہے۔ مگر باقی چھ زمینیں کدھر ہیں؟ کیا ان پہ بھی ہماری زمین کی طرح زندگی موجود ہے؟

۴۔ نزول قرآن حکیم

کیا قرآن حکیم نازل ہونے سے پہلے ہی مکمل شکل میں حرف بحرف لوح محفوظ میں موجود تھا۔ اگر ایسا تھا تو اس کی حکمت کیا تھی؟

جیسا کہ قرآن حکیم کے مطالعے سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس میں رسول کریم ﷺ کی اپنی ذات اقدس اور ان کے اپنے دور کے بہت سارے حالات وواقعات کے متعلق آیات کریمہ درج ہیں۔ تو اس تناظر میں سارے کے سارے قرآن حکیم کے پہلے سے لوحِ محفوظ میں درج ہونے کی کیا حکمت ہو سکتی ہے؟

اس کے علاوہ وہ کچھ آیات کریمہ پر عمل درآمد کو نبی کریم ﷺ کی زندگی میں منسوخ کر کے ان کی جگہ متبادل آیات کریمہ (نئے احکام کے ساتھ) نازل کی گئیں۔ (مسئلہ ناسخ ومنسوخ)

البرہان

اگر کوئی صاحبِ علم لون صاحب کے استفسارات کے جوابات مرحمت فرمائیں تو البرہان انہیں بخوشی شائع کرے گا۔